تارِ پیراہن

شان الحق (حقّی)

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

تارِ پیراہن

سرورق: مع قلمکاری و
خطاطی واندرونی تصاویر   ازمصنف

کتابت   عابد سعید
مطبع   انٹرنیشنل پریس، کراچی
ناشر   اُردو اکیڈمی سندھ کراچی
تعداد   ۱۲۵۰ جلد

جون ۱۹۵۸ء

★

مُشرّف کے نام ——

عنوانات

نامنظوم

اِس عنوان تک پہنچتے پہنچتے آپ کتاب کے کئی صفحے پلٹ چکے ہوں گے۔ اِس
مجموعۂ نظم کے لئے اتنی تمہید بھی کافی ہو سکتی تھی۔ شاید یہ حرفِ ناموزوں آپ کو گراں گزرے
لیکن یہ اور جو کچھ بھی سہی، کتاب کا مزید اشتہار نہیں ہے بلکہ ناشر کی نظر بچا کر لکھا جا رہا ہے،
اُن کی کتاب طباعت کی آخری منزلوں میں ہے، اور اُن کی اِس متاعِ عزیز کے بارے میں
میرا غیر محتاط باتیں کرنا شاید مفید نہ ہو۔ تاہم ادیب کو احتساب کی پروا نہیں کرنی چاہیئے؛
میرا اصل معاملہ اپنے پڑھنے والوں ہی کے ساتھ ہے۔

میں اِس کے لئے اپنے ناشر سے معذرت خواہ ہوں اور اُن کا ممنون بھی کہ انھوں نے
اِس مجموعے کو اتنے شوق سے چھاپا اور میرے پیرایۂ تار تار کو ایک آراستہ صورت بخشی۔
دراصل اِس زمانے میں ادبی پرکھ ناشر ہی کا حصہ ہے، اور ادیبوں پر انہی جوہر شناسوں
کے احسان زیادہ ہیں۔ میں اپنے اُن کی بعض پُر تکلف روایات کا بہت قائل ہوں یعنی

حسرت آتی ہے کہ اِس مجموعے پر "حسبِ فرمائشِ فلاں" کیوں لکھا ہوا نہیں۔ آپ چاہیں تو یہاں "اُردو اکیڈمی سندھ" کا نام فرض کرلیں۔

اِس "حسب فرمائش" والے تکلف کا مطلب صرف جرأتِ اظہار کی کمی نہ تھی بلکہ شاید اس کو ہماری تہذیب کے اِس اُصول سے کچھ معنوی تعلق تھا جس کی ایک مثالی مگر بدنام صورت ہے: "پہلے آپ"۔ البتہ یہ بھی ہے کہ اب طائرِ تخیل کوچہ و بازار سے قریب تر پرواز کی کوشش کرتا ہے اور شاعری اکثر ایک پیغام کی صورت بھی رکھتی ہے۔ قلبی واردات کو پُکار کر پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی: ع "شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا!" نہ فن کو پُکار کر پیش کرنے سے فن کی آبرو بڑھتی ہے لیکن پیغام کو پُکار کر پہنچانا شرط ہے۔

ایک عرصے تک تو میری شاعری میں پیغام کا کیا ذکر، مضمون کا بھی پتہ نہ تھا۔ بعض کیفیات میں کچھ کہنے کو جی چاہتا تا اگر بات تھوڑی سی نغمہ آفرینی سے آگے نہ بڑھی۔ پھر میں نے قصداً بھی اِس میں کچھ مدّعا داخل کرنے کی کوشش کی مگر آورد ہوکر رہ گئی۔ البتہ جو بیکار و لاحاصل باتیں، خود بخود اور خواہ مخواہ موزوں ہوگئیں، اُن میں کوئی دلچسپ نکتہ، لطیفہ یا الفاظ کا ایک انوکھا سا مجموعہ ضرور ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ موزوں کلمات اپنی نظر میں کچھ زیادہ پرمعنی ہوتے چلے گئے۔ لیکن اِس شعر گوئی کے ساتھ ایک تشنگی کا احساس بھی رہا کہ جو کچھ کہا وہ بہت ادھورا اور ناکافی ہے۔ یہ تشنگی مشقِ شاعری کے ساتھ بڑھتی ہی گئی اور اِس مجموعے کو پیش کرتے وقت بھی شدّت سے محسوس ہوتی ہے۔

اِس مستقل تشنگی و ناتمامی کے علاوہ تخلیقی کاوش کے وقت بھی ایک خلش یا تشنگی کا احساس رہا، جو کبھی تھوڑی سی آمد کے بعد اور کبھی پوری نظم یا غزل ہوجانے کے بعد وقتی طور پر دُور ہوگیا۔ مگر ایسی صورت میں یہ طے کرنا محال تھا کہ یہ خلش کس خاص بات کی آمد

کے لئے تھی یا جس شعر کے کہنے سے جی ہلکا ہوا اُس میں کونسی خاص بات پائی جاتی تھی جسے کچھ بغیر گل دے پڑے شاید محض اظہارِ نفس کا سودائے خام ہو لیکن کبھی تو وہ زندگی کا کوئی بہت مانوس تجربہ یا بہت گہرا نقش بھی نہیں معلوم ہوتا یہ اپنی ذات کے وہ بھید ہیں جو پائے نہیں جاتے۔

اِس تحلیل و تجزیئے کے دَور میں تخلیقی عمل پر بھی بہت کچھ مشق جراحی ہوئی ہے۔ اُصولِ فطرت کی دریافت کے شوق میں اِنسانی ذہن اس جستجو میں بھی ہے کہ شاید اُس بنیادی اُصول کا پتہ لگائے جو تخلیق کے حیرتناک عمل میں کارفرما ہوتا ہے۔ اہلِ تخلیق بھی اِس کوشش میں اہلِ تحقیق کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ادب اور آرٹ کی بعض نئی تحریکات کی محرک بھی یہی جستجو ہے کہ لاشعور کو کس طرح حسبِ منشا کام پر لگایا جائے۔ گویا کہ فرشتۂ غیبی کو تسخیر کیا جائے۔ میں اِن تجربات کا مخالف نہیں ہوں، لیکن مجھے اِن کے نتائج ابھی تک اطمینان بخش نہیں معلوم ہوتے۔ اِن میں لاشعور کی جھلک تو ضرور ہوتی ہے لیکن اس کی وہی حیرت ناک خلاقی نہیں ہوتی جس کا کھوج لگانا مقصود ہے۔ سمندر سے سیپ نکل آتے ہیں مگر وہ گوہر جو یہ سمندر کبھی خود بخود اُگل دیتا ہے، اِس کانٹے میں نہیں پھنستے ؎

خود ہی ہو جاتا ہے قسمت سے کوئی غم بیدار
عشق کے ہاتھ میں تدبیر کہاں سے آئی

اِسی طرح صرف "تجربہ" کے ذکر سے آرٹ کی تحلیل کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اوّل تو تجربہ خود ایسی لامحدود سی چیز ہے کہ اِس کا اور چھور پانا مشکل ہے؛ دوسرے تجربہ کی شکل آرٹ میں کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے؛ تیسرے اُن کاوشوں "نفس میں کئی پشتوں بلکہ پوری نسل کے تجربات کے نقوش ثبت ہوتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تجربات میں ایک ایسا نیا اور

عجیب عنصر داخل ہو جاتا ہے جو در اصل ساری تخلیقی کیمیا کی جان ہے۔

میں نہ سائنس کے طریق کار کا مخالف ہوں، نہ عقل کا دشمن مگر سائنس کو اعتراف ہے کہ اُس نے نفسِ انسانی کی ابھی صرف سطح کو چھوا ہے۔ میرے خیال میں نفسِ انسانی کا تخلیقی عمل ایک ایسی پراسرار حقیقت ہے جس کا 'فارمولا' ناقابلِ دریافت ہے۔ جدید سائنس کا مشاہدہ ہے کہ کبھی کبھی مادّی مظاہر میں بھی ایسے عمل واقع ہوتے ہیں (یعنی بعض ایٹمی برقپاروں کی غیر متوقع جست) جن کی توجیہہ محال ہے۔ اسی جدید مشاہدے نے اس نئے عقیدے کو راہ دی ہے کہ فطرت کے معلومہ قوانین در اصل اتنے اٹل نہیں جتنے کہ سمجھے جاتے رہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ ایک جدید تصوّف کا آغاز ہے اور عجب نہیں کہ آگے چل کر سائنس کو تحقیق کا پرچم کسی قسم کی روحانیت ہی کے حوالے کرنا پڑے۔ اِن چند حواسِ ظاہری سے شاید کُل کائنات کا احاطہ ممکن نہ ہو جن کی مقدرت سراسر محدود ہے۔

مستقبل میں روحانیت کی شکل کیا ہوگی، یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن غالباً یہ اُس روحانیت سے مختلف ہوگی جسے ہم اب تک روحانیت کا نام دیتے رہے۔ میرے گمان میں اس کی کچھ جھلک دنیا کی شاعری میں موجود ہے۔ شاعری جو منطق کی میزان کے بغیر حقائق کو جانچ لیتی ہے، اور اس تجربے سے ہم کو ایسی تشفّی حاصل ہوتی ہے جو دلیل اور مشاہدے سے بھی حاصل نہیں ہوتی؛ لہٰذا میں شاعری کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔

اِس طرح شاید مذہب اور شاعری میں جزوے مشترک نظر آئے، لیکن میرے خیال میں سائنس کی طرح مذہب کے ساتھ بھی شاعری کا میل، اگرچہ ماضی میں بہت گہرا رہا ہے، دیرپا نہیں ہو سکتا۔ روایتی مذہب کے لئے ایک اٹل عقیدہ، ایک اٹل ضابطۂ رسوم اور حق و باطل کی اٹل تفریق لازمی ہے۔ کیونکہ اس

کا بنیادی مقصد معاشرے میں اخلاقی نظم و ضبط قائم رکھنا ہے، جس کے لئے عمل کی واضح حدود اور حتمی سند مہیا ہونی چاہیئے۔ شاعری کے نزدیک حقیقت کا تصور اور ہے۔ وہ حقیقت پر اتنے مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالتی ہے کہ کبھی کبھی خود اپنے مشاہدے کی تردید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں شاعر کی حیثیت سے حقیقت کے اسی عجیب تصور، اسی لچکدار روپ کو اپنے لئے زیادہ قابل قبول سمجھتا ہوں (کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَان) آخر وہ کیا قدرِ مشترک ہے جو اتنے متنوع کلام کو ہمارے لئے یکساں پُراثر اور پرمعنی بنا دیتی ہے؟ اس کی تعریف محال ہے، لیکن شاید اس قدرِ مشترک میں حقیقتِ اصلی کی ایک خفیف جھلک پوشیدہ ہے۔ ذہنِ انسانی کا کام حقیقت کے اس متحرک متنوع اور ناقابلِ تسخیر تصور کا مسلسل تعاقب کرنا ہے' اور شاعری بھی اس کوشش میں معاون ہے جس طرح شعوری مشاہدہ حقیقت کے در باز کرتا ہے، فن کا متحرک تخلیقی عمل بھی جو تصورات پیدا کرتا ہے وہ حقیقت سے خارج نہیں کہے جا سکتے، بلکہ میرا خیال ہے کہ تخیل کی آمیزش سے اس میں ایک "جہت" اور بڑھ جاتی ہے۔

دے رہی ہے صدائے نے پیغام　　　میرے ساتھ آؤ، ہاں قدم تو ملاؤ

آپ یہ خیال نہ کریں کہ میں خیال کی بے ربطی کو سراہ رہا ہوں۔ شاعرانہ تخیلات میں ظاہری بے ربطی کے باوجود بڑے گہرے ربط کا پتہ ملتا ہے۔ اس کی اصل گواہ ان کی تاثیر ہے یہ تاثیر نہ محض زورِ بیان سے پیدا ہوتی ہے نہ حُسنِ تعلیل سے، نہ کسی اور خارجی عنصر سے، بلکہ کسی اور ہی بات سے، جسے ایک بنیادی صداقت کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اب جدید طبعیات میں بھی حقیقت و تصور ایک دوسرے سے بعید نہیں رہے۔ جدید ذہن کے نزدیک طبعیاتی حقائق نے ریاضی کے مفروضات کی شکل اختیار

کرلی ہے جن کا وجود داخلی ہے نہ کہ خارجی۔ مادّے کی اصل توانائی ہے، حرکت بغیر جسامت اور کیفیت بغیر کمیّت کے ممکن ہے۔ خلائیں خم پایا جاتا ہے، جو پہلے صرف محبوب کی خیالی زلفوں یارات کی سیاہی سے مخصوص تھا۔ فضا کے اسی خم کے باعث (نہ کہ کشش ثقل کے متروکہ قیاس کی بنا پر) زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، خطِ مستقیم خطِ منحنی کا دوسرا نام ہے۔ اب سے پہلے یہ انوکھے تصورات صرف شاعری سے مخصوص تھے۔ یہ علم انسانی کے عظیم کارنامے ہیں لیکن یہ وہ انکشافات ہیں جن پر اہلِ فلسفہ نے اپنا گریبان چاک کر کر لیا ہے اور منطق و ریاضی شاعری سے زیادہ قریب آ گئے ہیں ؎

خرد بھی ہو گئی آخر جنوں کی ہمنوا شاید
دبستانوں سے آتی ہے سلاسل کی صدا کیسی

آخر یہ شاعری جس کی میں نے اتنی ہوا باندھی کہاں پائی جاتی ہے، جو بیک وقت مجازی بھی ہوتی ہے اور ماورائی بھی؟ یوں تو یہ تعریف بیشک مثالی و تصوراتی ہے لیکن یہ تصور بے بنیاد نہیں، اتنا ہے کہ خدا جانے میں کس طرف اشارہ کروں اور آپ نے خود اسے کہاں کہاں دیکھ رکھا ہو؛ لہٰذا اس بارے میں آپ کا اپنا تاثر ہی زیادہ معتبر ہوگا۔ خود میرا روئے سخن صرف فلسفیانہ شاعری کی طرف نہیں۔

میں اس بات کے لئے معذرت خواہ ہوں کہ اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ یہ بے تکے "متشاعرانہ" کلمات بھی آپ پر مسلط کئے اور ایسے موضوع چھیڑ دئے جن پر ان مختصر صفحات میں صرف چند بے تکی باتیں ہی کہنا ممکن تھا۔ یہ میں نے اپنے ساتھ بھی زیادتی کی ہے کہ شاعری کے ذکر کو طول دیا: اب شاید یہ تُک بندیاں آپ کو اور بھی بے مزا لگیں جن کو پیش کرنے کی جرأت میں نے کی ہے؛ البتہ میں نے دنیا کی شاعری

کے بعض شہ پارے بھی اپنے دامن میں سمیٹ لئے ہیں، اور اس دلیری کے ساتھ کہ جیسے اپنا ہی مال تھا۔ بقولِ غالب ؎

مکن گمانِ توارُد یقیں شناس کہ دُزد

متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بُرد است!

بہرصورت، میں انہیں اس مجموعے کی آبرو سمجھتا ہوں۔ اگرچہ ان تراجم کے انتخاب میں ہاتھ روک کے رکھا ہے ورنہ سلسلہ وار تھا۔ شیکسپیئر کے ڈرامے سے کئی اقتباس موجود ہیں مگر اور بہت کچھ تھا جو نہیں شامل کیا گیا۔ یہ ڈرامہ اس لحاظ سے شاید ایک نیا تجربہ سمجھا جائے کہ ایک مغربی ڈرامے کو جو مشرق سے بھی قریب ہے اور محبت کا عالمگیر عنوان رکھتا ہے، مثنوی میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر اس طرح کہ ڈرامے کی تعریف سے بھی خارج نہیں ہوتا، اور سطر بہ سطر اصل کا پابند رہتا ہے۔ اس زمانے میں نہ صرف منظوم بلکہ مقفیٰ ڈرامے کو یورپ کے بعض نامور ادیبوں نے بھی آزمایا ہے۔ البتہ یہاں اصل ڈرامہ نظم معرّیٰ میں تھا جو یورپ میں قصہ گوئی کے لئے ایسی ہی چلتی ہوئی چیز ہے جیسے کہ ہمارے ہاں مثنوی۔ نہ معلوم شیکسپیئر علیہ الرحمۃ کی روح اس تصرّف سے خوش ہوگی یا خفا۔ شاید پڑھنے والوں کو اس بارے میں کچھ اشارت یا بشارت ملے۔

اقبال اکیڈمی کے ایک حالیہ جلسے میں ایک فاضل بزرگ نے اقبال کے اس "عجیب" قول پر بحث کی دعوت دی کہ "اسلامی ادب اور آرٹ ابھی پیدا نہیں ہوئے۔" مجھے یہاں اسلامی ادب اور آرٹ کے مفہوم سے بحث نہیں، البتہ علامہ اقبال کی مراد بلاشبہ مثالی ادب اور آرٹ سے تھی یعنی جو اُن کے نزدیک ادب اور آرٹ کا

آیڈیل تھا۔ اور اِس حد تک میرا احساس بھی کچھ ایسا ہی ہے (دراصل یہ ایک شاعرانہ انداز تھا۔ ایسی ہی ایک بات مارکس نے بھی کہی تھی کہ اشتراکیت کے قائم ہونے پر "ماقبلِ تاریخ" کا دَور ختم اور "اصل تاریخ" کا آغاز ہوگا) لفظی کاریگری سے قطع نظر جس کی مثالیں آپ کو اِن اوراق میں بھی مل جائیں گی، اعلیٰ وجدانی شاعری اپنے مختلف رُوپ میں ایک آیڈیل تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے جس کا واضح تصوّر محال ہے۔ اِس لحاظ سے مجھے اپنی شاعری کا ہر وہ عزیز ہے جس میں کوئی مؤثر تجربہ یا وہ حیرت کا عنصر موجود ہو جو اُس کے وجدانی ہونے پر دلالت کرتا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ میں تو لفظی کاریگری کا بھی منکر نہیں ہوں ع

'ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے!'

اپنی شاعری کے اِس پہلے مجموعے کو پیش کرتے وقت مجھے بے اختیار بعض بچھڑے ہوئے لوگ یاد آتے ہیں۔ معلوم نہیں پڑھنے والوں کو اس بیان سے کتنی دلچسپی ہوگی، مگر یہ بھی میرے دل کا ایک معاملہ ہے۔ والد مرحوم احتشام الدین صاحب نے مجھے شاعری سے ہمیشہ منع کیا! لیکن ظاہر ہے کہ میں نے اُن کی صحبت سے بے اندازہ فیض پایا ہے۔ ان کے علاوہ اُستاد بیخود دہلوی، مولانا احسن مارہروی، پنڈت کیفی، مجاز، میراجی اور ڈاکٹر تاثیر کا نام قلم پر آتا ہے، جن کی ہمت افزائیوں کا میں زیر بار ہوں۔ مجاز میرے علی گڑھ کے سینیئر برادر تھے، میراجی سے دُور کی ملاقات ہی میسر آئی، ڈاکٹر تاثیر سے بہت سی بافیض صحبتیں نصیب ہوئیں۔ یہ لوگ اپنے جوہرِ ذاتی کے ساتھ نکتہ نوازی کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ مجاز نے میرے کلام پر کبھی منہ بنا دیا ہوتا تو نہ معلوم مجھ جیسے نفسیاتی مریض کی خود اعتمادی کا کیا

حال ہوتا، جس نے برسوں مشاعروں کی صورت دیکھنا بھی وقتِ سمجھا۔ برخلاف اس کے انہوں نے بعض ایسے کلام کو بھی مبالغے کے ساتھ سراہا جو اتفاق سے اس مجموعے میں نہیں۔ اُن کا اصرار تھا کہ تم اپنا تخلص اور رکھو ـــــ تخلص تو صحیح معنوں میں کوئی تھا ہی نہیں، نہ شاعری سنجیدگی سے اختیار کی تھی؛ چونکہ شاعروں کو لوگ تخلص ہی سے پہچانتے ہیں اس لئے خواہ مخواہ ایک تخلص بن گیا اور کبھی کبھی ضرورتِ شعری کے باعث اختیار بھی کرنا پڑا۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ گویا نام ہی بدل ڈالوں مگر یہ بھی بزرگوں کا عطیہ ہے۔ پھر آنجہانی اک بدلو لنے کہار جائیں گے۔ یہ اُس وقت کی بات تھی۔ مگر واقعی ایک بار میں نے آورد کے طور پر کچھ نئے نام سوچے بھی تو والد مرحوم نے کافی آزردگی کا اظہار کیا اور مجھے دنیا کی ساری باتیں چھوڑ کر اسی ایک نکتے پر بغاوت کرنا اچھا نہ معلوم ہوا۔

والد صاحب کے بعد لڑکپن میں میرے بڑے بھائی "مشرف" کا ساتھ میرے ادبی ذوق کے حق میں ضرور سازگار رہا۔ یہ خود بھی اس وقت خوش گو شاعر تھے، پھر تعلیم کے لئے باہر گئے اور برسوں سے پردیس ہی میں مقیم ہیں۔ عجب نہیں کہ بہت سے خطوط کی طرح بہت سی شاعری بھی لکھ لکھ کر صرف دراز میں بند کر دی ہو۔ دوسری غنیمتِ زمانہ ہستیوں میں جناب ممتاز حسن، مرزا محمد سعید، پروفیسر احمد علی، آغا محمد یعقوب دواشی، میاں ارشد حسین، چودھری محمد علی ردولوی، اختر حسین رائے پوری، علامہ رشید ترابی، سید ذوالفقار علی بخاری، عزیز اسد مجید ملک، بیگم آمنہ ملک، ڈاکٹر عترت حسین زبیری، ابوالاثر حفیظ، حضرت جگر مراد آبادی، سید ہاشمی فرید آبادی، رئیس امروہوی، زیبا ردولوی، اختر انصاری اکبر آبادی، صمد شاہین، ممتاز شیریں

بزرگوں اور دوستوں کے چند نام ہیں جن کے خلوص اور ہمت افزائیوں سے میں
متاثر ہوا ہوں ۔ ممتاز حسن کو لوگ ماہر مالیات کی حیثیت سے زیادہ جانتے
ہیں ، لیکن اُن کے دوسرے رُوحانی کمالات بھی کم نہیں ۔ پھر میرے قدیم دوست
صدیق احمد صدیقی ، اخلاق احمد دہلوی ، شریف الحسن ، منظر صدیقی جمیل الدین
عالی ، ماجد علی اور آخر نہ کہ اخیر الطاف گوہر، چند عزیز شخصیتیں ہیں جو بیغاقیوں
کو بھی سراہ لیتی ہیں ۔ شاید میں نے غلط کیا کہ ایک نا تمام بساط پھیلائی ۔
اب اسے سمیٹنا مشکل ہے ـــــــــ

سلمیٰ نے اپنے کالج کی معلمی اور خانہ داری کے دو ہرے بکھیڑوں کے ساتھ
ساتھ میری طرح کے ایسے اور ویسے آدمی کو وہ ذہنی سکون مہیّا کیا جس کے
بغیر کوئی تخلیقی کام مجھ سے ممکن نہ ہوتا ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تشکّر کے
الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں ۔ اس کتاب کی ترتیب و تصحیح میں بھی اُن ہی
کا دم میرا معاون رہا ۔ انہوں نے اِس کے لئے ایک دلچسپ تعارف بھی
لکھ ڈالا ، جسے میں نے تکلّفاً شامل نہیں کیا ہے ۔

"ایک دن آئے گا کہ کتاب مکمل ہو جائے گی ۔
میرے ماضی کا ایک جزو بن چکی ہو گی ،
اور شاید اس کی روشنی میں ضحی کے نقوش
قدرے زیادہ خوشگوار نظر آئیں" ۔ سارتر

کراچی
جون ۱۹۵۵ء

شان الحق (حقی)

تارِ پیراہن

غزلیات ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک

تماشانِ بہاراں میں شامل

ن ہمارا ابھی تارِ پیراہن



اِک ترا من ہے ایک میرا من
دیکھ پیکارِ آتش و آہن

دل اُجالے کہاں سے لائے اور
میری آنکھیں ہیں رُوپ سے روشن

ایک ہی رَو میں ہیں رواں ہم تم
دیکھیے کس کی چال کس کا چلن

ہیں جُدا ہر بہار کی رسمیں
سِل رہا ہے جنوں کا پیراہن

یوں مِلا دل کو ایک نکتۂ راز
جیسے زنداں میں کُھل گیا روزن

ہے تو پیشِ نظر کوئی تصویر
کون جانے ذرّیش ہے یا درپن

ق

ہائے کیف اُس کے رقص کا جیسے
کھُل نہ جائیں تو توڑ دوں بندھن
دیکھنا پیچ و تاب شعلۂ شوق
جیسے ہاتھ آ کے رہ گیا دامن

تھا نشانِ بہار میں شامل
اک ہمارا بھی تارِ پیراہن
صبر کیا ہو کہ میں نے دیکھی ہے
آج اُس کی جبیں پہ غم کی شکن
لاکھ پھولوں کے عارضوں کی اوس
دیکھنا میرا حاصلِ دامن
کر دیا میری سوزشِ دل نے
تختۂ گل کو آتشِ گلخن

آج تک کشتِ غم ہے ہریالی
سو ہجومِ بہار ، ایک لگن
مِرے بچھڑے تو پھر نہ ملنے پائے
اے سکھی سائے ؟ نا سکھی ساجن

اور کیا ہو گی نذرِ دل اے دوست
اک غزل ، اک نوائے ساز شکن

دل اُس کا مرے پیار سے گھبرا کے نہ رہ جائے
دُور آتشِ دل! پھول ہے کمہلا کے نہ رہ جائے

اے رہ گزرو! اُس کو دلانا تو مری یاد
وہ مجھ کو یونہی بھول کے بسرا کے نہ رہ جائے

آجاؤں کسی بات پہ گر یاد بھی اُس کو
جی اور کسی بات سے بہلا کے نہ رہ جائے

اک نیم نظر دل کی خرابی کی طرف بھی
خوبی پہ کوئی ناز ہی فرما کے نہ رہ جائے

بھاری ہے بہت دل کی مُرادوں کا سفینہ
یہ گنجِ گراں بیچ میں دریا کے نہ رہ جائے

ہے گرچہ سخن حرفِ محبت سے بہت دُور
ظالم کہیں ایمائے سخن پا کے نہ رہ جائے

اے جانِ طرب! دیکھ ادا موجِ ہوا کی،
یہ سر کو یونہی ساز سے ٹکرا کے نہ رہ جائے

نغمہ یوں ساز میں تڑپا مری جاں ہو جیسے
میرا دم ہو، مرے سینے کی فغاں ہو جیسے

یک بیک رُوح میں اُٹھا ہے وہ طوفانِ خموش
وادیِ گل میں نسیم گزراں ہو جیسے

نغمہ ورقص ہوئی جاتی ہے ہر موجِ خیال
چاندنی رات میں دریا کا سماں ہو جیسے

کیا سناتی ہے یہ سازوں کی صدائے دلسوز
کچھ ہمیں درد نصیبوں کا بیاں ہو جیسے

یوں تری چشمِ مدارات پہ دل بھُولا ہے
نشۂ مے پہ جوانی کا گماں ہو جیسے

دل ہے یوں بے دلیٔ ہوش کے ہاتھوں لرزاں
کوئی قاتل سے طلبگارِ اماں ہو جیسے

راہ چلنے کی کہاں سوختہ جانی کے بغیر
ہر نفس شعلۂ خاطر کا دھواں ہو جیسے

خوب نقشہ ہے مرے فکر کی جولانی کا
کوئی کم بخت اسیری میں جواں ہو جیسے

اُس نے یوں عرضِ محبت پہ سنبھل کر دیکھا
اُس کے دل کو تو خبر ہو نہ گماں ہو جیسے

اک نوا حاصلِ صد عہدِ فغاں ہے حقیؔ!
بوئے گل لاکھ بہاروں کا نشاں ہو جیسے

اتنا ہی نہیں ہے کہ ترے بن نہ رہا جائے
وہ جاں پہ بنی ہے کہ جیئے بن نہ رہا جائے

اب دسترسِ شوق ہے بس نام تک اُس کے
اکثر جسے سو طرح لکھے بن نہ رہا جائے

غم بُردہ سہی، غنچۂ افسردہ سہی دل
تم پیار سے دیکھو تو کھلے بن نہ رہا جائے

ہے دل ہی وہ ناداں کہ ہو تدبیر سے نومید
اور پھر کوئی تدبیر کیے بن نہ رہا جائے

اُفتاد میں کچھ سعیٔ متانت نہیں چلتی
رونے کو جو رو کیں تو ہنسے بن نہ رہا جائے

ہم وہ ہیں کہ صد کعبہ و صد دیر کے ہوتے
گوشہ کوئی تعمیر کئے بن نہ رہا جائے
کچھ دیر گزرتی ہے کہ اے بلبلِ ناشاد
صیاد سے نخچیر ہوئے بن نہ رہا جائے
ہر چند کہ فرقت میں تری زہر ہو جینا
کچھ قہر ہے ایسا کہ جئے بن نہ رہا جائے

محبت خارِ دامن بن کے رُسوا ہو گئی آخر
یہ اقلیمِ عزیزاں بے زلیخا ہو گئی آخر

بساطِ آرزو تصویرِ صحرا ہو گئی آخر
وہ ہنگاموں کی بستی ہُو کی دنیا ہو گئی آخر

نشانِ صبح یوں گم ہے کہ اب نکلے نہ جب نکلے
اُدھر اندازِ شب ایسا کہ گویا ہو گئی آخر

مری آنکھوں کا بس اک خواب تھی وہ حسرتِ پنہاں
جو خود اُن کی نگاہوں کا تقاضا ہو گئی آخر

قلم کو ہے اُسی صورت کدے کی جستجو یعنی
کہیں پنہاں تھی وہ صورت جو پیدا ہو گئی آخر

فقط ایماں ہی کیا پامال ہیں ایماں شکن لاکھوں
دلوں کی وہ متاعِ کافری کیا ہو گئی آخر

نمودِ صبحِ وعدہ سے تو خیر امید ہی کیا تھی
وہ فرقت کی شبِ ہنگامہ آرا ہو گئی آخر

کبھی یہ لرزشیں سازآشنا ہوں گی تو دیکھو گے
دلوں کی بے کلی آشوبِ دریا ہو گئی آخر

ہم اپنے چاکِ دامن پر بہت رُسوا رہے حقّی
نظر آئینِ محفل سے شناسا ہو گئی آخر

ہر اک وجودِ سزا ناسزا کو پیار کیا
بتوں کو دہر کو خود کو خُدا کو پیار کیا
نہ پُوچھ دہر کی کس کس جفا کو سر پہ سہا
نہ پُوچھ دہر کی کس کس بلا کو پیار کیا
کبھی بہار بھی آئی کبھی چمن بھی کھلے
صبا نے گل کو تو گل نے صبا کو پیار کیا
یہیں کسی نے کسی خوش ادا سے سر جوڑا
یہیں کسی نے کسی دلربا کو پیار کیا
ہمیں کو یہ چمنِ دل کُشا نہ راس آیا
ہمیں نے اک گلِ ناآشنا کو پیار کیا

رَوا سمجھ کے ترے ہر ستم کو لُطف کہا
ادا سمجھ کے تری ہر جفا کو پیار کیا

تری نظر میں جو رُسوا ہے ماسوا بن کر
مری نظر نے اُسی انتہا کو پیار کیا

نہ جانے جان پہ کیا بیت کر رہے اُس روز
کبھی جو اُس کے لبِ جانفزا کو پیار کیا

یہ شوقِ دل کے کرشمے یہ آرزو کا نصیب
کہ نغمہ بن کے لبِ خوشنوا کو پیار کیا

چارۂ دردِ زندگی فرماؤ — دلبرو دلرباؤ دلآراؤ!
دل کو اُجڑا صنم کدہ نہ بناؤ — ہیں بہت صورتیں رساؤ بساؤ
تم نگاہوں کی روشنی ٹھہرے — بوئے گل کی طرح سے کیوں کتراؤ
دے رہی ہے صدائے نَے پیغام — میرے ساتھ آؤ، ہاں قدم تو ملاؤ
کیا کمی اُس کے زلف و رخ میں ہے — دل کو دیر و حرم میں کیوں بھٹکاؤ
دیکھنا اُس کی گفتگو کے ڈھنگ — کیا نکلتے ہیں سادگی میں سبھاؤ
دوستو، شرط ہے کہ میرے بعد — میری رسوائیوں کو بھول نہ جاؤ
مل رہی ہے فغانِ دل کی داد — رُوح پر ہو رہا ہے کیا پتھراؤ
علم کے بے گداز خاوندو! — کیوں زمیں پر ہو چاند پر اُڑ جاؤ
دے گیا دردِ اہلِ دل کو داغ — تم بھی شانوں پہ زلف کو بکھراؤ

رہ گئی لوحِ آرزو سادہ — ہو گیا حرف حرف کا ستھراؤ
خونِ ارماں کی یاد آتی ہے — مے میں اب اور کوئی رنگ رچاؤ
کس طرح دل کے داغ دنیا کو — یوں دکھاؤں کہ تم نہ دیکھنے پاؤ
کیا حقیقت یہاں سہاروں کی — سخت ہے سیلِ زندگی کا بہاؤ
پل رہے ہیں ضمیر میں طوفاں — دردمندوں کی خامشی پہ نہ جاؤ
آخرِ شب کے ٹوٹتے تارو! — مجھ کو اپنا پتا بتاتے جاؤ

جامِ مے سامنے تو ہے حقّی
مے اُڑی جا رہی ہے، ہوش میں آؤ

بڑے دوستی میں خسارے ہیں یارو
مگر کیا کریں دل کے مارے ہیں یارو
شبِ ماہ ہے، ماہ پارے ہیں یارو
قیامت کے سامان سارے ہیں یارو
جو اُترے چلے آ رہے ہیں زمیں پر
یہ کس آسماں کے ستارے ہیں یارو
کہاں تک یہ اپنے پرائے کا قصہ
سبھی غم ہمارے تمہارے ہیں یارو
جہاں کی تہاں پھر رہی ہیں نگاہیں
جہاں کے جہاں چھان مارے ہیں یارو

نگر سے نگر تک زمینوں کے سر پر
یہی چاند سورج ستارے ہیں یارو
کہاں چھوٹ سکتے ہیں غم زندگی کے
یہ غم زندگی سے بھی پیارے ہیں یارو
نہ مرتے نہ جیتے ، نہ ڈوبے نہ تیرے
خبر ہی نہیں کس کنارے ہیں یارو
میسر کسے دل کے تاروں کو چھونا
بہت نغمہ گر اس میں ہارے ہیں یارو

یہ بھی تھی حسرتِ نمو کی جلی
بجھ رہی ہے سُلگ سُلگ کے کلی

کچھ نشانِ سحر بھی لے شبِ غم!
ہے کہاں تک یہ تنگ و تارگی

بے خبر تجھ سے تیری یاد بھی
صبحِ وعدہ سے شامِ ہجر ڈھلی

کتنے حشر اُٹھ کے شرمسار گئے
اُس کی زلفوں کی رات ہی نہ ڈھلی

دل میں بس کر رہا خیال اُس کا
کچھ ارادوں کی پیش ہی نہ چلی

دل فگاری کہ لالہ کاری ہے
سادگی ہے کہ حکمتِ عملی!

دیکھیے دیکھیے بہار آئی
لیجیے لیجیے وہ بیت چلی!

یہ غنچے مکھ نکالے خوبصورت　　صنم ہیں بھولے بھالے خوبصورت

بہت گوشے پڑے ہیں دل کے خالی　　کوئی بستی بسا لے خوبصورت

پسند آئے صنم خانے کے ہم کو　　صنم چُپ رہنے والے خوبصورت

نہ پائے دل نے اے اُمیدِ باطل　　اندھیروں سے اُجالے خوبصورت

رہے خالی کے خالی گرچہ دل نے　　ہزاروں جام ڈھالے خوبصورت

نظر میں پھر گئے ساون کے منظر　　وہ بادل کالے کالے خوبصورت

ذرا کچھ دُور سے لگتے ہیں کتنے　　یہ مسجد یہ شوالے خوبصورت

کھلے ہیں بوسۂ مینا سے کیا کیا　　نظر آتے ہیں پیالے خوبصورت

اِسی دنیا کے اک گوشے میں اے دل!　　کوئی دُنیا بنا لے خوبصورت

سخن اک طرزِ خاموشی ہے گویا،
پڑے ہیں منہ پہ تالے خوبصورت

نہ دیکھا وحشتِ دل یوں بھی یکسو نظر آنے لگے صحرا میں آہو
نہاں تک ڈھونڈیئے تسکیں کا پہلو بسی ہے شامِ غم میں بوئے گیسو
بنا ہے ایک غم اک عالمِ غم بدلتا جا رہا ہے درد پہلو
یہ شب کی ظلمتِ نیرنگ، تو یہ نظر پہ ہو گیا دشوار قابو
ذرا بتلا تو اے بادِ بہاری ترے دامن نے پونچھے کس کے آنسو؟
ہوئیں وہ بھی شکار افسونِ غم کی جو آنکھیں کر چکی تھیں دل پہ جادو
فراقِ صحبتِ شب کا نشاں ہیں دلیلِ شامِ عشرت تھے جو گیسو
نہیں ایسا گراں سامانِ ہستی بہت ہیں چند آہیں، چند آنسو

جہاں میں کون ہے آسودہ دامن
ہمیں رسوا ہیں لیکر دردِ پہلو

رہے کیا کیا نقابیں رُخ پہ ڈالے
دلوں کے شکھ نگاہوں کے اُجالے

بس اک خط پر یہ کیفیت ہو دل کی
کوئی جیسے گلے آکر لگالے!

کہیں کیا بن ترے آنکھوں کا عالم
دئے روشن در و دیوار کالے

نگاہوں کو نہ کرتے کاش ویراں
خیالوں کو گلستاں کرنے والے

ہے دنیا لذّتِ غم کی بھی دشمن
جو غم ہے آج ہی اے دل منالے

نبھیں گے تم سے کیا اندازِ تمکیں
چھلک جاتے ہیں ہر جنبش پہ پیالے

مرا ساماں یہ وسعت یہ فضائیں
مرا حاصل یہ نغمے اور یہ نالے

بے خبر ہے دلوں سے دَورِ زماں
ساز ٹوٹے ہیں، رقص ہے کہ رواں!
حُسن ہے دشت و در میں جلوہ کناں
عشق کن خلوتوں میں ہے پنہاں
یہ شب مہ یہ بزمِ ماہ وشاں
اے مرے شاہدِ خیال، کہاں؟
اک کرشمے کی ہو گئیں آنکھیں
اک تجلّی پہ لُٹ گیا ایماں
خرمنِ دل پہ میرے ٹوٹ پڑے
بجلیوں کے بنے ہوئے انساں

ہو رہے ہیں سنبھل سنبھل کے کلام
اور ہم بھی سمجھ رہے ہیں کہ، ہاں!
منزلیں مجھ سے، گردشیں میری
مجھے جہاں کل وہیں ہیں کون و مکاں
کرتی جاتی ہے صیقلیں حیرت
کھلتی جاتی ہے جوہروں کی زباں
دیکھ کھلتے ہیں یوں چمن سے چمن
دیکھ بنتے ہیں یوں جہاں سے جہاں
چھا رہا ہے خمارِ خوابِ بہار
اِن دنوں چشمِ گل کو ہوش کہاں
ڈالے جاتے ہیں بجلیوں پہ حجاب
روکی جاتی ہے آندھیوں کی عناں
دیدۂ آرزو کی محرومی!
کیفِ نظارہ ہے نہ خوابِ گراں
یہ فسانے ہیں میری رُوح کے راز
یہ ترنّم ہے میرے دل کی زباں

اثر نہ ہو تو اسی منطقِ بے اثر سے کہہ
چھپا نہ دردِ محبت جہاں بھر سے کہہ

جو کہہ چکا ہے تو اندازِ تازہ تر سے کہہ
خبر کی بات ہر اک گوشِ بے خبر سے کہہ

چمن چمن سے اُکھڑ کر رہے گا پائے خزاں
روش روش کو جتا دے شجر شجر سے کہہ

بتانِ ناز کے کیا گوشِ بے اثر سے خطاب
مرادِ دل کی گدایانِ رہ گزر سے کہہ

شبابِ تشنہ کی خونابہ نوشیوں کو نہ بھول
مرے فسانۂ رنگیں کو پیشتر سے کہہ

بیانِ درد نہیں قیل و قال کا محتاج
کبھی فغاں میں ادا کر کبھی نظر سے کہہ

سفر ہی شرطِ حیات اور جہت ہی شرطِ سفر
پکار کر یہ رفیقانِ ہمسفر سے کہہ!

اگرچہ ہے تمہیں اپنے ہر اک بیاں سے گریز
کروگے قول سے نظروں کے کس زباں سے گریز
دبیں چھپے نہ ہوں اے دل حقیقتوں کے نشاں
مری نظر نے کیا ہے جہاں جہاں سے گریز
بقدرِ شوق تھی تمہیدِ مدّعا، لیکن
کوئی مقام نہ سوجھا کہ ہو کہاں سے گریز
شروعِ راہِ وفا ہے ابھی تو دیکھئے گا!
کوئی یہاں سے کرے گا کوئی وہاں سے گریز
بڑی حسیں ہے یہ کیفیتِ قبولِ وفا!
کہ دل سے سیکڑوں اقرار اور زباں سے گریز

کسے فسانۂ ہستی کی ابتدا معلوم
بجز ایں قدر کہ ہوا دل کی داستاں سے گریز

ہے یہ بھی تابِ تقاضا کا امتحاں شاید
وگرنہ کیوں ہو انہیں دل کے امتحاں سے گریز

لکھی تھیں دل کے مقدر میں اُلجھنیں ورنہ
مری وفا نے تو چاہا تھا ہر گماں سے گریز

شب کی تنہائی میں مانے کہ نہ مانے کوئی شخص
بھید کیا کیا مجھے آتا ہے بتانے کوئی شخص!

سہنی پڑتی ہے خدائی کی دہائی مجھکو
چھیڑ دیتا ہے زمانے کے فسانے کوئی شخص

ایسی بے حاصل و بے کیف گزرتی ہے حیات
جیسے گنتا رہے تسبیح کے دانے کوئی شخص

وہ کرشمے وہ نظارے وہ نظر ہی نہ رہی
لے گیا لوٗٹ کے آنکھوں کے خزانے کوئی شخص

دل میں کچھ ڈھونڈھتی رہتی ہیں کسی کی نظریں
مجھ سے کیا پوچھتا رہتا ہے نہ جانے کوئی شخص

نغمۂ چند کی موجوں کے سہارے بڑھ کے
چاند تاروں کو چلا دام میں لانے کوئی شخص

طالبِ ذوقِ نظر اور بھی نکلے موجود
ہائے پیدا نہ کیا تجھ سا خدا نے کوئی شخص

حُسنِ تاثیر کو صورت سے نہ معنی سے غرض
شعر وہ ہے کہ لگے جھوم کے گانے کوئی شخص

شعلہ سا جیسے ساغرِ مے سے لپک اٹھا
بھڑکی وہ دل کی پیاس کہ پیالہ چھلک اٹھا
نظریں پڑیں تو رُخ پہ پسینہ دمک اٹھا
گلرنگ سی اُفق پہ ستارہ چمک اٹھا
یوں دل میں جھلملائی فضا اُس دیار کی
نظروں میں جیسے تیرا ہی آنچل جھلک اٹھا
کیا خونِ ناب کی سی روانی ہے ساز میں
اک رندِ خوشنوا تھا کہ پی کر چہک اٹھا
اس طرح آئی جھوم کے اک موجِ پُرخروش
حدِّ نگاہ تک خطِ ساحل لچک اٹھا

کافر ہوں گر کلام تری دوستی میں ہو
اتنی ہی بس خلش ہے کہ کیوں دل میں شک اٹھا

نظروں کو میری اُس گلِ خوبی کی ہے تلاش
ہر صبح جس کی یاد میں گلشن مہک اٹھا

اپنے ہی ذوقِ نغمہ کا پھونکا ہوا ہے دل
بجھ کر کسی کی یاد کا شعلہ بھڑک اٹھا

دے گیا ہے نظر کو تیرا غم
یک سحر نور یک چمن شبنم

دیکھنا دار و گیرِ بت خانہ
دستِ آذر سے کانپتے ہیں صنم

ہے جہانِ نظر فروزاں تر
اور آنکھوں کی روشنی مدّھم

کیا تماشا ہے اے تماشائی!
ہے لبوں پر ہنسی اور آنکھیں نم

زخمہ کیا دادِ دلکشائی دے
رہ گئے ساز ہی میں نغمے کم!

راگنی سوگ میں ہے روپ اداس
جیسے مل کر بچھڑ گئے بالم

دیکھتا ہوں کہ دستِ گلچیں میں
کوئی گل ہے کہ شعلۂ برہم

ایک ہی شب میں وقت کا دھارا!
اک طرف تیز اک طرف مدھم

دیکھتے تم بھی کاش اے زاہد!
جس گھڑی منہ سے بولتے ہیں صنم

کاہشِ نے کو نغمگی کہہ لو!
زندگی بھر رہا لبوں پر دم

خوں شدہ حسرتوں کا ماتم کیا
اے بسا آرزو کہ میدارم!

تم سے اُلفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنّا تھی کہ چاہے جاتے

دل کے ماروں کا نہ کر غم کہ یہ اندوہ نصیب
زخم بھی دل میں نہ ہوتا تو کراہے جاتے

ہم نگاہی کی ہمیں خود بھی کہاں تھی توفیق
کم نگاہی کے لئے عذر نہ چاہے جاتے

کاش اے ابرِ بہاری ترے بہکے سے قدم
میری اُمید کے صحرا میں بھی گاہے جاتے

ہم بھی کیوں دہر کی رفتار سے ہوتے پامال
ہم بھی ہر لغزشِ مستی کو سراہے جاتے

لذّتِ درد سے آسودہ کہاں دل والے
ہیں فقط درد کی حسرت میں کراہے جاتے

ہے ترے فتنۂ رفتار کا شہرہ کیا کیا
گرچہ دیکھا نہ کسی نے سرِ راہے جاتے

دی نہ مُہلت ہمیں ہستی نے وفا کی ورنہ
اور کچھ دن غمِ ہستی سے نباہے جاتے

اک مہک سی دمِ تحریر کہاں سے آئی
نام میں تیرے یہ تاثیر کہاں سے آئی

پہلوئے ساز سے اک موج ہوا گزری تھی
یہ چھنکتی ہوئی زنجیر کہاں سے آئی

دم ہمارا تو رہا حلقۂ لب ہی میں اسیر
بوئے گل یہ تری تقدیر کہاں سے آئی

اہلِ ہمت کے مٹانے سے تو فارغ ہو لے
دہر کو فرصتِ تعمیر کہاں سے آئی

گو ترستا ہے ابھی تک تری تحریر کو دل
پھر بھی جانے تری تصویر کہاں سے آئی

یہ بھی ہو جاتا ہے قسمت سے کوئی غم بیدار
عشق کے ہاتھ میں تدبیر کہاں سے آئی

کس طرف جاتے ہیں یارب یہ بگڑتے ہوئے نقش
یہ سنورتی ہوئی تصویر کہاں سے آئی

لحنِ بلبل کا چلا کون سے گُل پر افسوں
صرف اک طرز ہے تاثیر کہاں سے آئی

پڑ گیا سوزِ سخن ہاتھ ہمارے کیونکر
خاک ہونے کو یہ اکسیر کہاں سے آئی

بُھلا دو رنج کی باتوں میں کیا ہے
ادھر دیکھو مری آنکھوں میں کیا ہے

بہت تاریک دن ہیں پھر بھی دیکھو
اُجالا چاندنی راتوں میں کیا ہے

نہیں پاتیں جسے بیدار نظریں
خدایا یہ مرے خوابوں میں کیا ہے

یہ کیا ڈھونڈے چلی جاتی ہے دنیا
تماشا سا گلی کوچوں میں کیا ہے

ہے وحشت سی یہ ہر چہرے پہ کیسی
نہ جانے سہم سا نظروں میں کیا ہے

یہ اک ہیجان سا دریا میں کیوں ہے
یہ کچھ سامان سا موجوں میں کیا ہے
ذرا سا بَل ہے اک زلفوں کا اُس کی
وگرنہ زورِ زنجیروں میں کیا ہے
ہیں خمیازے سُرورِ آرزو کے
نشاط و غم کہو نامول میں کیا ہے
تمہاری دیر آمیزی بھی دیکھی
تکلّف لکھنؤ والوں میں کیا ہے

ہمیں سے اس قدر رغبت ہمیں سے سرگراں ایسے
کبھی تم مہرباں ایسے کبھی نامہرباں ایسے

لُٹا کر اک نشیمن ہم نہیں کچھ نوحہ خواں ایسے
سلامت ذوقِ بربادی، ہزاروں آشیاں ایسے

طریقے دل نے دیکھے ہیں ستمگاری کے، ہاں ایسے
کہ نشتر زہرناک ایسے نہ خنجر خونفشاں ایسے

ہمارے ہی لئے ظالم ترے ہونٹوں پہ ہے پیدا
ہنسی، سوہانِ دل آنی، سخن آزارِ جاں ایسے

مری بربادیوں پر ہیں مری غم خواریاں ایسی
کہ یارب اور بھی کچھ غم نصیبِ دوستاں ایسے

نہ بھولو تم ہمیں لیکن ، نہ ہوں گے بے نشاں ہم ہی
نہ آتا ہو یقیں لیکن ، گزرتے ہیں گماں ایسے

خبر کیا تھی کہ یوں کرنا پڑے گا رازِ دل افشا
خبر کیا تھی کہ بچھڑیں گے ہمارے رازداں ایسے

فقط منظور ہے سوزِ وفا کو امتحاں اپنا
نہ تم سے بدگمانی ہے نہ غیروں پر گماں ایسے

نہ دیں دل اسکو ہاں لیکن، کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں
ادائیں دل فریب اُس کی ، کرشمے دلستاں ایسے

فسردہ ہے مگر مُردہ نہیں یہ "شاخِ گل" ، حقّی
ذرا خونِ جگر دیجے تو پڑ جاتی ہے جاں ایسے!

ایمائے غزال کرتی ہیں موسم کی ادائیں
اک موجِ ترنم کی ہوس میں ہیں فضائیں

آ ہم تجھے محرابِ تمنا میں سجائیں
اے شمعِ وفا، دُور ترے سر کی بلائیں

ہر گام پہ کہتی ہیں وہ بدمست ادائیں
جب ہاتھ میں خنجر ہو تو کیوں ہوش میں آئیں

نغموں کی زباں میں کوئی سمجھے تو بتائیں
کیا چیز ہیں یہ طرز یہ طرحیں یہ ادائیں

روکے نہ گئے سینۂ خارا سے وہ طوفاں
ہیں جن کو کناروں میں لئے تنگ قبائیں

آئینے سے ہوتی ہیں صلاحیں کہ کسی کو
جب خوب مٹانا ہو تو کس طرح مٹائیں
ایسی ہی ترے شہر میں ہوتی ہے مروّت
ایسی ہی مرے دیس میں ہوتی ہیں وفائیں

دیکھے کوئی افلاک کا یہ جوشِ تباہی
تنکے کو ڈبونا ہو تو طوفان اُٹھائیں
ٹھہرا ہوں اُسی بات پہ میں لائقِ تعزیر
جس بات پہ بخشی گئیں اوروں کی خطائیں

دیوانوں کو دنیا سے اُلجھنے کی کہاں تاب
فرصت ہو تو اک اور ہی دنیا نہ بنائیں
یہ کونسے زنداں کی گرائی گئی دیوار
یہ کونسی تعمیر کی اُٹھتی ہیں بِنائیں

اے مسکنِ خوبانِ زماں شہرِ عزیزاں
ہم بھی کبھی بِکنے ترے بازار میں آئیں

اک طرزِ دلبری کو تقاضا سمجھ کے ہم
اے سادگی کہ رہ گئے کیا کیا سمجھ کے ہم

ذوقِ نظر کے دم سے گوارا ہے رنجِ زیست
خود کو بھی دیکھتے ہیں تماشا سمجھ کے ہم

ہے اب جہانِ شوق پہ حدِ نظر بھی تنگ
کن بستیوں میں بس گئے صحرا سمجھ کے ہم

بہلا رہے ہیں ذکرِ کرم ہائے دوست سے
دل کو جفائے دہر کا مارا سمجھ کے ہم

اُٹھّا نہ بارِ غم دلِ ارماں پرست سے
جیتے ہیں داستاں کو ادھورا سمجھ کے ہم

اِس دورِ غم میں کس کو میسّر ہے دَورِ مے
پیتے ہیں ایک جرعے کو دریا سمجھ کے ہم
وہ بھی بس اک بہانۂ فریادِ خلق تھا
لیتے رہے جو نام کسی کا سمجھ کے ہم
ہے جھولیوں کے مول یہاں وہ سرشکِ خوں
رکھتے تھے جس کو آنکھ کا تارا سمجھ کے ہم
نکلا درِ حضور فقط سنگِ رہگزار
پتھر کو پوجتے رہے کیا کیا سمجھ کے ہم
حقّی زمانہ یاد دلاتا ہے پھر وہ غم
جن کو بھلا چکے تھے فسانہ سمجھ کے ہم

گاہے گاہے نفسِ شوقِ غزل خواں بھی رہے
راحتِ دل بھی بنے، دوست پہ قرباں بھی رہے

سایۂ ابرِ بہاری میں یہ کیا شورِ فغاں
زُود کشِ برق کوئی نغمۂ جولاں بھی رہے!

ہاتھ میں رشتۂ صد عقدۂ مشکل رکھیئے
ہاں کسی سروِ خوش اندام کا داماں بھی رہے

گردشِ جام رہے سوختہ جانوں کو نصیب
پھر بُرا کیا ہے جو یہ گردشِ دوراں بھی رہے

کہ نہیں منبر و محراب و مصلّیٰ سے ہمیں
طاق و تصویر و چراغ و گلِ داماں بھی رہے

یادِ ایّام کہ تو مائلِ دل سوزی تھا!
ہم ترے شہر میں آئے ترے مہماں بھی رہے

ہم گلستاں میں رہے بوئے محبت بنکر
گرچہ آوارہ و برباد و پریشاں بھی رہے

یاد میں جن کی ٹپک پڑتی ہے شبنم اب بھی
دامنِ شوق میں وہ پھول سے ارماں بھی رہے

حسرتیں دیکھئے دل کی کہ رہے درد فزوں
اور وہ جانِ ستم درپئے درماں بھی رہے

دل ہو مُشتاق تو آدابِ نظر بھی سیکھے
آنکھ بے خواب بھی پُر آب بھی حیراں بھی رہے

اے وہ رفتار جو کھینچے لئے جائے دل کو
ہائے وہ موج سفینے سے گریزاں بھی رہے

راہِ ہستی میں تو ایماں کی مناتے رہے خیر
وائے گر راہِ عدم میں ضررِ جاں بھی رہے

ہیں یہی دیکھیے کشتی کے ڈبونے والے
آپ ہی خیر سے کشتی کے نگہباں بھی رہے!

گل نے سیکھا خلشِ جبر میں خنداں رہنا
ہائے وہ لب جو اسیری میں غزل خواں بھی رہے

خدا رکھے چراغِ محفلِ رندانہ روشن ہے
ابھی ہم دل جلوں کے ہاتھ میں پیمانہ روشن ہے

بہت بیتی شبِ وعدہ نہیں بے آس دل پھر بھی
چلے آنا اگر چاہو، چراغِ خانہ روشن ہے

یہی مسلک ہے وہ جس میں زبردستی نہیں چلتی
جو چاہے شوق سے آئے رہِ میخانہ روشن ہے

سوائے یک چراغِ رہ گزر کیا شرحِ دل کیجئے
کہ گرد و باد کے طوفاں میں بیباکانہ روشن ہے

ہمارے جوہرِ پنہاں کو غربت خوب راس آئی
سرِ محفل نہ چمکا تھا سرِ ویرانہ روشن ہے

بجھے کیا کیا چراغِ خانماں افروز کیا کہیئے
کہ جن کی یاد سے دل میں اک آتش خانہ روشن ہے

ہوئیں خاموش وہ شمعیں حرم کا نام تھا جن سے
خدا کے فضل سے اب بھی بہت بتخانہ روشن ہے

مری چشمِ تماشا نے یہ افسانہ بھی دیکھا ہے
کہ گُل ہے شمع اور خاکسترِ پروانہ روشن ہے

وہی محرابِ دل ہے اور وہی شمعِ وفا اب بھی
کسی کی یاد میں کیا آرزو مندانہ روشن ہے

نہ جانے کتنی یادوں سے بسی ہے دل کی پہنائی
نہ جانے کتنی شمعوں سے یہ خلوت خانہ روشن ہے

گناہِ شوق کی یارب یہی پاداش کیا کم تھی
زمانے بھر کی نظروں پر مرا افسانہ روشن ہے

پھر ہے چند خوش اوقات نہ ملنے پائیں
مل بھی جائیں تو خیالات نہ ملنے پائیں

جانے بوجھے بھی نہ آئے تری سیرت پہ یقیں
دل سے آنکھوں کے بیانات نہ ملنے پائیں

ضبط یہ ہے کہ رہے تیرے اشاروں پہ نظر
اور نظر سے مرے جذبات نہ ملنے پائیں

غیر کی آنکھ بچا کر مجھے دیکھو کہ اُسے
نشر کرنے کو حکایات نہ ملنے پائیں

نظرِ بد سے بچے دامنِ شفّاف ترا!
خوں تو کیا خاک کے ذرّات نہ ملنے پائیں

دیکھ کر غیر کو چھوڑی رہِ دنیا میں نے
یعنی اُس سے مری عادات نہ ملنے پائیں

وقت کہتا ہے کہ اُجڑی ہوئی اُمیدوں کو
یوں مٹا دو کہ نشانات نہ ملنے پائیں

ہے ہزار آفتِ جانی کا صلہ داغِ جگر
جی چرا ؤ تو یہ تمغات نہ ملنے پائیں

جو راز داں تھے ہمارے چھپے ہوئے ہیں کہیں
وہ بے نشان ستارے چھپے ہوئے ہیں کہیں

نہیں گمان مرا منزلِ فنا کی طرف
فلک سے ٹوٹ کے تارے چھپے ہوئے ہیں کہیں

گلوں کی سیج نہیں خلوتِ خیال اے دوست!
یہی سمجھ کر شرارے چھپے ہوئے ہیں کہیں

وہی ستارے کہ تھے آمدِ سحر کے نقیب
سحر کے خوف کے مارے چھپے ہوئے ہیں کہیں

مری نگاہ سے رہتی ہیں چشمکیں جن کی
وہ ناتمام نظارے چھپے ہوئے ہیں کہیں

ہیں میرے دل سے شناسا ہزار پیکرِ ناز
کہ لاکھ رُوپ نکھارے چھپے ہوئے ہیں کہیں
کسی کی آنکھ سے ہے برملا کہیں چشمک
کسی کے دل سے اشارے چھپے ہوئے ہیں کہیں
بیانِ شوق نہیں قیل و قال کا محتاج !
مرے سخن میں اشارے چھپے ہوئے ہیں کہیں

سب جلوے ہو چکے وہ ہماری نظر کے خواب
یہ دیکھتی ہے چشمِ تمنّا کدھر کے خواب

سو رنگ سے نگاہ میں آئے سنور کے خواب
نکھرے ہیں دل کے خون ہی کیا کیا نظر کے خواب

گرویدہ ہو گئے مرے ذوقِ نظر کے خواب
چھوڑیں گے چشمِ شوق کو دیوانہ کر کے خواب

آنکھ اب بھی دیکھتی ہے تری رہگزر کے خواب
جلووں سے جن کے گرد مرے عمر بھر کے خواب

ایسا بھی تھا کبھی، کہ شبِ ماہتاب میں
میری نظر میں بھی تھے کسی کی نظر کے خواب

دیکھے کوئی شباب کی آسودہ خوابیاں
اللہ رے اِس ایک شبِ مختصر کے خواب

ساقی یہ شرط ہے کہ زمانے کی ضد پہ ہم
رکھ دیں ہر ایک تلخ حقیقت کو کر کے خواب
اس طرح دل میں تیری تمنا ہے آج بھی
جیسے نگاہِ گل میں طلوعِ سحر کے خواب
ہو جیسے آئینے سے خجل حسنِ بے حجاب
یوں بھاگتے ہیں میری نگاہوں سے ڈر کے خواب
آئینہ ہو گئیں تری نظروں کی شوخیاں
افسانہ بن گئے مری حیراں نظر کے خواب
کیا کہیئے اس جراحتِ پنہاں کی لذتیں
دل کے فسردہ زخم ہوئے ہیں نکھر کے خواب
یاد آ رہی ہے صحبتِ یارانِ ہم سخن !!
چونکا رہے ہیں وشت میں دیوار و در کے خواب
ہے مجھ کو آج بھی ترے وعدوں پہ اعتبار
کچھ رہ گئے ہیں خواب کی حد سے گزر کے خواب
گم ہو گئے ہیں آہ وہ جلوے کہ حسن کا اب
نظّارہ جیسے جی ہو میسّر نہ مر کے خواب

ایسے فرزانوں کو ہم کیا کہیں اور کیا نہ کہیں
اُس سے پھر روٹھ بھی جائیں جسے دیوانہ کہیں!

لوگ تم سے بھی ستم پیشہ کہاں ہوتے ہیں
جو کہیں کا نہ رکھیں۔ اور پھر اپنا نہ کہیں

اُن سے ہو جاتے ہیں وحشت میں کچھ ایسے بھی کلام
لوگ سُن پائیں تو دونوں ہی کو دیوانہ کہیں

ہے سوا تیرے کہیں، اے دلِ شوریدہ بتا
کوئی معمورۂ وحشت، جسے صحرا نہ کہیں

ہم کو جاناں سے نہ کچھ پرسشِ جانانہ سے کام
غم کو اب غم ہی کہیں کیوں غمِ جانانہ کہیں

ذوقِ مستی بھی خداداد ہے جس کو مل جائے
جرأتِ مست کہیں مستیٔ صہبا نہ کہیں

کھل گئی اہلِ نظر، دل کی بھی سب دیدہ وری
حسرتِ دید کو اب ذوقِ تماشا نہ کہیں

ہم کو خدمت یہ ملی ہے کہ سرِ محفلِ ناز
حسن کی بات کریں، عشق کا افسانہ کہیں

ہیں خرابات میں کچھ ایسے ہی بے وضع سے لوگ
طرز، رندانہ رکھیں، بات حکیمانہ کہیں

اس کو کیا کہیے، اب ان کا یہ پہنچا ہے پیام
ہم سے ایسے نہ خفا ہوں ہمیں ایسا نہ کہیں

غمِ دل، اے غمِ دل، اے حاصلِ صد عالمِ دل
تجھ کو کیا کیا نہ پکاریں تجھے کیا کیا نہ کہیں

حاصلِ حرف و حکایت ہے فقط ذوقِ نوا
ایک ہی حرف جسے شرحِ صد افسانہ کہیں

یہ شوخی نرگسِ مستانہ ہم سے چھلک کر رہ گیا پیمانہ ہم سے
درازی کہہ رہی ہے شامِ غم کی کہ سنتے جائیے افسانہ ہم سے
صدائے ہاؤ ہو آتی ہے شب بھر ذرا کچھ دور ہے میخانہ ہم سے
اشارہ کر رہی ہیں سو نگاہیں کہ پی لو ایک ہی پیمانہ ہم سے
ہوئے ویراں تو کتنے شہر بارے بہت آباد ہے ویرانہ ہم سے
تمہیں کیا شکوۂ دوراں سے مطلب سنو اک حرفِ مشتاقانہ ہم سے
لکھی تھی جس میں مختاری جہاں کی کوئی لے جاؤ وہ پروانہ ہم سے

چراغِ در میں حالِ غم نہ پوچھو
بڑھا لو رونقِ کاشانہ ہم سے

ہم نے سینے میں رکھا غم کو دل و جاں کی طرح
پاسِ دشمن بھی کیا خاطرِ خوباں کی طرح

بزمِ ہستی ہے صنم خانۂ ویراں کی طرح
آدمی دہر میں نایاب ہے یزداں کی طرح

کوئی گردش ہے تو تقدیر سے میری ورنہ
سست ہے دَورِ زماں بھی ترے پیماں کی طرح

شکوۂ رنج نہ کر شرطِ محبّت یہ ہے!
حوصلہ ہو تو اُٹھا ناز بھی احساں کی طرح

تھی بس اک برقِ تبسّم کہ تکلّم نہ بنی
جنبشِ لب تھی مگر جنبشِ مژگاں کی طرح

پھونک دو خانۂ نشیمن کہ یہ کانٹے دل میں
چبھ رہے ہیں کسی بھولے ہوئے ارماں کی طرح

نالۂ غم بھی نہیں ، شورِ طرب کا کیا ذکر
شہر کے شہر ہیں سنسان بیاباں کی طرح

کم نہیں اب بھی تمناؤں کا سینے میں ہجوم
خانۂ دل وہی آباد ہے زنداں کی طرح

اک سہارا ہے جسے دامنِ حسرت کہیے
ہر قدم ساتھ مگر غم گریزاں کی طرح

دوستو! ڈھونڈیئے کیا مشربِ باقی کا نشاں
ہے کوئی بزمِ خیالی دلِ ویراں کی طرح

مجھ کو تسلیم نہیں دل کے بھی دعوے حقی!
میں نے رکھی ہے اسی کفر پہ ایماں کی طرح

گو نظر رہ گئی کافر تری خنجر بن کے
من میں آتی ہے تری یاد منوہر بن کے

کیا ملا خاکِ گلستاں کو گلِ تر بن کے
بت صنم خانے کے اچھے رہے پتھر بن کے

دل کے ماروں کا نہیں ذکر انہیں بھی دیکھو
دل میں جو درد لئے پھرتے ہیں دلبر بن کے

جانے اُس جانِ نزاکت کا رہا ہو کیا رنگ
رہ گئی یاد میں جس کی مرے جی پر بن کے

کیا خبر تھی کہ زمانہ ہی نہ ہوگا در پے
تم بھی اک روز دکھا دو گے ستمگر بن کے

دل سے مٹتی نہیں اُس صحبتِ ناساز کی یاد
آہی جاتا ہے خیالوں میں وہ منظر بن کے

آسرا ڈھونڈھ لیا بے در و دیواری کا
ہم سلامت ہیں تو صحرا میں رہے گھر بن کے

ہاتھ آیا نہ پتہ منزلِ آزادی کا
سنگِ منزل بھی رہا راہ کی ٹھوکر بن کے

اُس نے بولے تھے کبھی پیار سے جتنے سخن
اب وہی دل میں چبھا کرتے ہیں نشتر بن کے

وہ لاکھ غیروں پہ مہرباں ہوں چھپا نہیں اُنکا پیار ہم سے
نوازشیں اُس طرف ہیں بے حد، تو ناز بے اختیار ہم سے

بندھا تھا عمرِ وفا شکن ہی کا عہد، نا اُستوار ہم سے
ترے تصدق تری خطا کیا، نہ ہو سکا انتظار ہم سے

اگرچہ پہلوئے گلستاں میں بہت کھٹکتے ہیں خار ہم سے
ہمیں ہیں پھولوں کے ناز پرور، رواں ہے کارِ بہار ہم سے

کوئی بتلائے کہ ہم کریں اس ادائے تمکیں کو پیار کیونکر
وہ یوں گریزاں ہیں ہم سے گویا کبھی نہ تھے ہمکنار ہم سے

بجا کہ پامالِ ناز ہیں ہم ، مگر یہ رفتارِ ناز تا کے
رہے گا کجرو اگر تو کب تک یہ دورِ ناسازگار ہم سے

فسردہ اک شاخِ سرنگوں سے یہ کہہ رہی تھی نسیمِ صحرا
کہ آ لگا دیں اک آگ ایسی، یہ دن رہے یادگار ہم سے

جلا دیئے جو چراغ ہم نے رہے گا دائم فروغ اُن کا
ہوئی بفضلِ خُدا فزوں تر صنم کدے کی بہار ہم سے

نہ جانے کب سے میانِ طوفاں سفینۂ دل کو کھے رہے ہیں
فلک نے دیکھا ہے دم ہمارا قضا نے مانی ہے ہار ہم سے

نہ آہِ دل سوز کوئی لب پر، نہ نغمۂ جانفروز پیدا
گئی ہے آنچل نسیمِ گلشن بچا کے بیگانہ وار ہم سے

خرد کی باریک بیں نظر میں وہ عقدہ کیا کیا کھٹک رہا ہے
جنوں میں ناگاہ رہ گیا تھا الجھ کے دامن کا تار ہم سے

ہمارے اشکوں ہماری آہوں ہمارے نغموں کا کھیل ہے سب
ہمیں ہیں ابرِ بہار پرور، بہار کے ہم بہار ہم سے

تجھے اے دشمنِ ایماں کہیں کیا کس قدر چاہا
کہ سچ جان کر پوجا ، ستمگر مان کر چاہا

گزرنا خلدِ ساقی سے نہ بے دامانِ تر چاہا
بہشتیں دُور تھیں ہم سے تو ہم نے دُور تر چاہا

نہ پُوچھ جرعۂ آبِ بقا کی تلخیاں ہم سے
کہ جھیلی جانکنی پیہم جو جینا لمحہ بھر چاہا

خرد کی نوکِ ناخن بھی شریکِ نشترِ غم ہے
ہر اک آزارِ ہستی نے مرے ہی دل میں گھر چاہا

دل ایسا دشمنِ آسودگی نکلا کہ کیا کہیے
نگاہوں نے بہت دنیا سے رکھنا بے خبر چاہا

ترے اُس کشتۂ تیغِ ادا کو مرحبا جس نے
نہ جلنا آگ میں سیکھا نہ کھنچنا دار پہ چاہا

بھلا اُس جانِ جاں کو کس جگر سے بے وفا کہیئے
کہ جس نے ناز بھی کرنا ہمیں سے خاص کر چاہا

وہ کیا غم تھا خدایا جس کی خاطر ہم نے دل پایا
وہ سودا کونسا تھا جس کی خاطر ہم نے سر چاہا

رہائی دردِ ہستی سے کہاں گو دردِ سر کہئے
گیا سر ہی سے وہ جس نے علاجِ دردِ سر چاہا

ہنر کیا، عیب کیا حقیؔ، نہ ہے وہ قدر داں میرے
جنھوں نے عمر بھر مجھ کو سمجھ کر بے ہُنر چاہا

پھر وہی دُنیا دلِ دیوانہ یاد آنے لگی
زندگی افسانہ در افسانہ یاد آنے لگی

کاروبارِ دل کے سو نقشے نظر میں پھر گئے
ایک صورت بن کے صورتخانہ یاد آنے لگی

دوستوں کی کج ادائی پر بھی پیار آنے لگا
دشمنوں کی شکلِ معصومانہ یاد آنے لگی

گردشِ قسمت پہ بھی دل وجد میں آتا ہے آج
مجھ کو گویا گردشِ پیمانہ یاد آنے لگی

پھر محبت پر محبت کا گماں ہونے لگا
ہوشمندئ دلِ دیوانہ یاد آنے لگی

آگیا پھر دل کے دعووں پر سراسر اعتبار
پھر وہ اپنی جرأتِ رندانہ یاد آنے لگی

پھر نظر کی شوخیاں سینے کو گرمانے لگیں
حُسن کی ہر طرزِ محبوبانہ یاد آنے لگی

ہر خطائے عشق پھر لیتی ہے دل میں چٹکیاں
ہر ہزیمت شوق کی دلیرانہ یاد آنے لگی

پھر ہر اک بیگانہ ہم صورت نظر آنے لگا
یک بیک ہر صورتِ بیگانہ یاد آنے لگی

بے دلی اس درجہ جب رُودادِ بے عنواں سے تھی
جانِ حسرت بن گئی، کیا کیا نہ یاد آنے لگی!

نصیبِ عشق غمِ دل ہو یا غمِ عالم
مرادِ عشق غمِ جاوداں ہے۔ بیش نہ کم

نہ پوچھ بُتکدۂ ہست و بود کا عالم
صنم تراش کے ہاتھوں سے کانپتے ہیں صنم

تمہیں تو ہوگی خبر قدسیو! کہ ان روزوں
فرازِ عرش پہ اُڑتا ہے کونسا پرچم

بڑی تلاش سے پایا ہے دردِ دل کا سراغ
لکھا ہے میں نے نئے سر سے قصّۂ آدم

اِسے بھی کر چلو نظارۂ چمن پہ نثار
ہے ساز و برگِ نظر ایک قطرۂ شبنم

مری نگاہ نے مانگی تھی حیرتوں سے پناہ
تو بڑھ کے زیست سے نکلے عجائباتِ عدم

گراں نہ ہو تو لکھیں خود فسانۂ غمِ دل
ہمیں بھی اذنِ رقم اے خدائے لوح و قلم

کسی کی بزمِ ہوس میں کسی کے آنے تک
الٰہی محفلِ ایجاد درہم و برہم

بجا سہی کہ حریفِ جفائے دہر ہے دل
کوئی جہاں میں حریفِ جفائے دل ہے تو ہم

کچھ ترے شوقِ ستم کا راز کھلتا ہی نہیں
آنکھ نے جو کچھ دکھایا دل نے مانا ہی نہیں

حسن کے بس میں محبت کا مداوا ہی نہیں
آرزو وہ زخم ہے دل کا اُبھرتا ہی نہیں

تھی تری تلخی مری ہی تلخ کامی کا جواب
تو نے سمجھا یا نہیں یا میں نے سمجھا ہی نہیں

تھے ترے دل میں بھی شاید میرے ہی دل کے سراغ
دل نے اس سر رشتۂ پنہاں کو پایا ہی نہیں

چل دیا دل میں جلا کر کتنی یادوں کے چراغ
عمر کا وہ لمحۂ روشن کہ ٹھہرا ہی نہیں

یوں ہوا اک دورِ رخصت جیسے گزرا ہی نہ تھا
یوں ہوا اک عیش گُم جیسے کہ پایا ہی نہیں

دل کے ویرانے ہیں کس ابرِ کرم کے منتظر
اب کوئی اِن بستیوں پر رونے والا ہی نہیں

حیف گر اشکوں سے تیرے ہو مرے غم کا علاج
اب قرار آ بھی گیا اب درد ہوتا ہی نہیں

اُس بتِ سادہ سے لیجے بندگی کی داد کیا
جو مرا ایمان ہے وہ اُس کا دعویٰ ہی نہیں

اور کس کس پر نہیں حقّی نگاہِ لطفِ دوست
اُس کو ہم سمجھے ہیں اپنا جو ہمارا ہی نہیں

امید کے افق سے نہ اٹھا غبار تک
دیکھی اگرچہ راہ خزاں سے بہار تک

رکھنے کو تیرے وعدۂ نامعتبر کی لاج
جھیلی ہے دل نے زحمتِ صبر و قرار تک

دیکھا ہے کس نے منہ سحرِ جلوہ ساز کا
سب ولولے ہیں ایک شبِ انتظار تک

صیاد کے ستم سے رہائی کا ذکر کیا
سو دام تھے قفس سے سرِ شاخسار تک

ماتم یہ ہے کہ ذوقِ فغاں بھی نہیں نصیب
بے سوز ہو گیا نفسِ شعلہ کار تک

جاتی ہے دل کی حسرتِ نظّارگی کہاں
نظّارہ ہوگیا ہے نگاہوں پہ بار تک

کیا اُس کی شان بندہ نوازی کا پوچھنا
بخشتا ہے مفلسوں کو غمِ شاہوار تک

پھر اس کے بعد دل میں نہ اُتری کوئی نگاہ
وہ تیزیاں رہیں ترے خنجر کی دھار تک

حقّی سے سرگراں ہی سہی نکتہ دانِ شعر
اِک رنگ ہو کہ ہے کچھ اِسی جانہار تک

یہ نکہتِ زلف آئی دمِ خواب کدھر سے
پہنچا یہ مرا آہوئے بیتاب کدھر سے

خالی ہی رہا دیدۂ بے خواب تو میرا
اِن تازہ کرشموں کے کھُلے باب کدھر سے

شائستۂ غم تھا دلِ آوارہ کہاں کا
اِس سنگِ سرِ رہ کو ملی آب کدھر سے

ہر اشک ہے آنکھوں کو تری یاد کا تحفہ
اور آئیں گے یہ گوہرِ نایاب کدھر سے

دُنیا نے تو دیکھے نہیں اے دل یہ ترے داغ
خورشید کدھر سے ہوئے مہتاب کدھر سے؟

مے خانوں سے بھی گھبرے ہیں اسرارِ معابد
مت پوچھئے آتی ہے مئے ناب کدھر سے

بخنے تو بہت سے ہیں سفینے میں تہِ آب
کیا جانیے ٹھہرا ہے سرِ آب کدھر سے

ساقی تری تسلیم میں کرنے کے لئے عیش
آتے ہیں یہ بے ملک کے نواب کدھر سے

برہم ہے نظامِ دو جہاں کچھ نہیں معلوم
کل نکلے گا خورشیدِ جہانتاب کدھر سے!

سچ ہے کہ اک غبار سا پیشِ نظر تو ہے
اس کا گلہ سحر سے نہ کیجے سحر تو ہے

ظاہر ہے یوں کسی کو بھلائے ہوئے ہے دل
ایسا ہی جیسے دشمنِ جاں، بے خبر تو ہے

مانا کہ داغ داغ ہے فردِ عمل تمام
لیکن بہت دراز نہیں، اس قدر تو ہے

کیوں چونکتا ہے دشت کو خالی سا دیکھ کر
اے خانماں خراب یہ تیرا ہی گھر تو ہے

ہم ناخوشِ ازل ہمیں آرامِ جاں سے کیا
خوش اس سے ہو گئے کہ کوئی چارہ گر تو ہے

اِس بودِ بے نمود سے نظریں نہ پھیریئے
یہ منزلِ نظر نہ سہی، رہ گذر تو ہے

مرنے کی آرزو ہے شبِ غم تو کیوں نہ ہو
جینے کے حوصلے کے لئے عمر بھر تو ہے

اچھا اِدھر نظر نہ سہی، اُس طرف سہی
محفل میں تم کو خیر، ہماری خبر تو ہے!

آخر کسی سبب سے تو ہوگی یہ بیخودی
دل میں کوئی خیال نہیں ہے، اگر تو ہے

کھنچنے لگا ہے آپ کوئی ہم سے دُور دُور
حقّی ہماری آہ میں کچھ کچھ اثر تو ہے

مختصر ہو یہ فسانہ تو قرار آئے کہیں
وہ بھی کیا عمر تھی اے دل جو گزار آئے کہیں

دہر میں مل نہ سکی اہل محبت کو اماں
کن حوادث سے گذر کر سرِ دار آئے کہیں!

رہ گئے دشتِ غریبی میں بگولے اُٹھ کر
تھی نگاہوں کو یہ حسرت کہ سوار آئے کہیں

منتظر اِک نگہِ گرم کا ہے جوشِ بہار
چوم لیں گل کو نگاہیں تو نکھار آئے کہیں

ہیں نگاہیں ابھی نیرنگیٔ ایام میں گم
یہ سماں آنکھ سے گذرے تو بہار آئے کہیں

ہم نے کھُل کر نہ کہا قصّۂ غم بھی اپنا
خاطرِ دہر پہ یوں بھی نہ غبار آئے کہیں

دل کو آئینہ بنایا ہے کہ بارے اک دن
اپنی صورت ہی پہ ظالم تجھے پیار آئے کہیں!

دیر سے قافلۂ عمر رواں ہے حقّی
اُس کا در آئے کہیں، اُس کا دیار آئے کہیں

ہر اک ادا سے نظر اُس کی دل اُبھا کے رہے
ہو بے خبر بھی تو پہلو کو گدگدا کے رہے

اُسے نہ بھولتا شاید، ہمیں نے عہد اُس کا
کچھ اتنا یاد دلایا کہ وہ بھلا کے رہے

شعار بن کے نہ رہ جائے بے کلی دل کی!
اسی گھڑی میں قیامت کوئی اُٹھا کے رہے

سُرورِ مے سے رہا تلخئ دہن کا گلہ
ہمیں تھے وہ جو محبّت کو غم بنا کے رہے

ملی ہے عشق کو اِک صُورتِ دوام یہی
کہ انتظار میں اُس دیر آشنا کے رہے

لگی ہے گھات میں کب سے نگاہِ جلوہ فریب
اندھیری شب میں کرشمہ کوئی دکھا کے رہے

خوشا وہ شعر جسے سُن کے یوں ہوا محسوس
کہ ہم رقیب کسی یارِ آشنا کے رہے

وہ جس سے لُطف بھی دو دن نہ نبھ سکا حقّی
قریب ہے کہ ستم سے بھی ہاتھ اُٹھا کے رہے

دیکھی توفیق غم گساروں کی　　خوش رہیں! خیر میرے پیاروں کی!

دردمندوں سے عذر خواہی بھی　　اک ادا ہے ستم شعاروں کی

حرف رسوا ہوئے صدا بن کر　　آبرو رہ گئی اشاروں کی

اک بہانہ ہے خستگی کے لئے　　ورنہ ہستی ہی کیا سہاروں کی

کیا نگاروں سے کجروی کا گلہ　　اب یہی چال ہے ستاروں کی

ہم نے احساسِ جبر بھی کھویا!　　رہ کے صحبت میں بادہ خواروں کی

لالہ زاروں سے آنچ اٹھتی ہے　　دیکھنا گرمیاں بہاروں کی

اک تکلف ہوئی ہم آغوشی　　　تنگ ہیں وسعتیں کناروں کی

یاد کرنا مجھے بھی اے تارو!　　　جب سجے بزم ماہپاروں کی

جامِ خالی کا دَور چلتا ہے

محفلوں میں ادب نگاروں کی

یہ زورِ طبیعت یہ سحرِ تکلّم — نہ ہو آج محفل میں گویا تمھی تم
کیا جس نے غیروں کو غرقِ ترحّم — ہمیں تک نہ آئی وہ موجِ تبسّم
فقط اک مرے ساغرِ مے کی عمدیہ — اٹھے ہیں زمانے میں کیا کیا تلاطم
غنیمت ہے یہ بھی کہ منزل کو پایا — نہ پوچھو ہوا راہ میں ہم سے کیا گم
بھلا آپ نے دل کا کیا دام کرنا — فقط اک اشارہ فقط اک تبسّم
کرم دیکھئے دشتِ وحشت کا ہم پر — مٹایا نہیں کر دیا ہے فقط گم
نہ منزل ہماری نہ منزل تمہاری — بہے جا رہے ہیں کہیں ہم کہیں تم

ہوا اس طرح ہم سے برہم زمانہ
زمانے کے دشمن ہیں گویا ہمیں تم

بہت دل سے غم دُور ہے غم نہیں
نگاہوں میں اک نور ہے نم نہیں

رواں گُل نہیں ہے کہ شبنم نہیں
چلا چل پسِ کارواں تھم نہیں

بہت بڑھ گئی برہمی بزم کی
ہمیں ہیں کہ اِس پر بھی برہم نہیں

یہاں نشہ و مے بھی ہیں دُور دُور
یہاں نغمہ و لَے بھی باہم نہیں

رہے گی جہاں سوزشِ دل نصیب
وہ جنّت ہی ہوگی جہنّم نہیں

ملے گا اُسے دردِ دُنیا بھی کیا
میسّر جسے دوست کا غم نہیں

گریزاں ہو جتنی اُن آنکھوں نے کیا
تم ایسے تو کچھ بھولے بالم نہیں

سَو حسرتوں کو دل سے مٹانا ابھی تو ہے
تکمیلِ آرزو میں زمانہ ابھی تو ہے

تب دیکھئے کہ تیغِ تغافل کا ہو حریف
دل مشقِ ناز ہی کا نشانہ ابھی تو ہے

کیا جانے کتنے رُوپ بھرے آرزوئے دل
کچھ ناتمام سا یہ فسانہ ابھی تو ہے

کیجئے گا رونقِ روشِ گُل کا اہتمام
کانٹوں کی تشنگی کو بجُھانا ابھی تو ہے

اک عُمر چاہیئے کہ بسیں تازہ بستیاں
اُجڑے ہوؤں کو دل میں بسانا ابھی تو ہے

اوراقِ روز و شب کے اُلٹنے سے کیا ہوا
عالَم وہی نظر میں پُرانا ابھی تو ہے

ہے وحشتوں کو کونسے موسم کا انتظار
دل جس میں چاک ہوں وہ زمانہ ابھی تو ہے

تلاشِ راحتِ ہستی میں نا حق کیا زبوں ہونا
تمہی جب جان و دل ٹھہرے تو مشکل ہو سکوں ہونا

یقیں کب تھا کہ لکھا تھا مقدّر ہی میں یوں ہونا
بڑی مشکل سے سیکھا ہے تمنّاؤں نے خوں ہونا

دعائیں دے کے چمکایا تھا برسوں جس کے جوہر کو
لکھا تھا دل کی قسمت میں اُسی خنجر سے خوں ہونا

کھٹکتی ہے نظر میں خیر خواہی رہ نشینوں کی
گوارا ہے زمانے کو سر افرازوں کا دوں ہونا

یہ بندے عیش کے ساقی، سُرورِ مے کو کیا جانیں
مزا دیتا ہے ساغر کا فقط ہم رنگِ خوں ہونا

جبینِ بندگی کیسی مقامِ سر فروشی ہے
جہانِ حق سے گویا سرکشی ہے سرنگوں ہونا

وہ خالی سی نظر میں رفتہ رفتہ بات سی پیدا
وہ سادہ سی ادا کا دھیرے دھیرے پُرفسوں ہونا

یہی اک دولتِ غم ہے متاعِ زندگی جس کو
کبھی اشکِ رواں بننا کبھی سوزِ دروں ہونا

کسے دیتی ہے دنیا فرصتِ لطفِ نظر حقیؔ !
قیامت ہے یہاں دم بھر نظر کا یوں سے یوں ہونا

زمانہ اور دکھلائے گا کیا اِس سے سوا دل کو
کہ مٹ کر رہ گئے وہ نقش جن پہ ناز تھا دل کو

عجب اک وہم سا دل میں عجب اک سہم سا دل کو
یہ کیفیت ہے اب دل کی نہ جانے کیا ہوا دل کو

مہک بن بن کے شامِ ہجر یاد آنے لگی اُس کی
نظر کی روشنی بن کر خیال آنے لگا دل کو

یہ کیا طوفان تھے یارب کہ یکسر دھو گئے دل سے
کچھ ایسے داغ بھی جن کی نہ ملتی تھی دوا دل کو

کبھی اک گُل کا مُرجھانا بھی تھا سامانِ صد ماتم
دعا دیجے زمانے کو کہ پتھر کر دیا دل کو

خدا رکھے علاقہ تھا کبھی بلبل کے غم سے بھی
خبر اب دل کو کیا دل کی، تعلق دل سے کیا دل کو

نہ راس آیا امیدوں کو وہ نازِ نارسائی بھی
کچھ اب آنے لگی اپنے ہی داغوں سے حیا دل کو

کہاں ذوقِ نظر، ہے بے دلی کا آسرا حقی
چمک جاتی ہیں شمشیریں، خبر ہوتی ہے کیا دل کو

ذوقِ راحت جن کو حاصل ہو انہیں حاصل سہی
ہے یہی منزل تو ہم گم کردۂ منزل سہی

جورِ دشمن میں عتابِ دوست بھی شامل سہی
سہل ہی کس پر تھا جینا اور بھی مشکل سہی

دیکھئے کیونکر بجھے ہم سوختہ جانوں کی پیاس
دل ہے صحرائے طلب تم ابرِ دریا دل سہی

خوش اداؤں کا وہ مجمع ہے کہ جاں دیجئے
ہر نظر کا پھر تقاضا ہے کہ ہم قاتل سہی

زہر ہو کر رہ گئی ترکِ محبت کی قسم
اُس کا وہ کہنا کہ اچھا ہم اِسی قابل سہی

صیدِ بسمل کو تو حاصل لبِ فریاد بھی ہے
کس کو معلوم کہ زخمی دلِ صیاد بھی ہے

اک ستم یہ ہے کہ دل خوگرِ ایجاد بھی ہے
عالم رنگ ہوئی جاتی ہے جو یاد بھی ہے

ذکرِ وعدہ سے خدارا نہ جلاتے دل کو
کیا وفا ہوگا وہ وعدہ جو تمہیں یاد بھی ہے

ہم گنہگار ہوئے لیکن فقط ذوقِ گناہ
ایک وہ ہیں جنہیں توفیقِ خداداد بھی ہے

ہم نوا بے غمِ دل جی کا بہلنا معلوم
ہو تو دلشاد وہی ہو کہ جو ناشاد بھی ہے

داد پائے گا ستم کی کوئی اِس شہر میں کیا
داد گر وہ ہے جو خود بانیٔ بیداد بھی ہے

اُس کا پانا نہ کوئی جان سے جانا مشکل
ہے فقط شوق کی تمہید اُٹھانا مشکل

مشکل ایسا غمِ دنیا سے نبھانا کیا تھا
دل سے سیکھے کوئی آساں کو بنانا مشکل

مجھ سے کہتی ہیں وہ سادہ سی نگاہیں دیکھو
حرفِ مطلب نہ زباں پر کوئی لانا مشکل!

دوستی تم نے تو کیا کچھ نہ نباہی ہم سے
ہو گیا ہم سے ہی یہ رسم نبھانا مشکل

خیر آنکھوں کی تو ہے پردہ در تک ہی پہنچ
ہے خیالوں سے بہت بھید چھپانا مشکل

مطلبِ دل ہے وہ گپ چپ کی پہیلی حقّی
بوجھنا جس کا ہے آسان، بتانا مشکل

کیوں پشیماں ہو، بہت ہیں مری یادیں مجھکو
تم سے پیاری تو نہ تھیں دل کی مُرادیں مجھکو

ہوں اِسی شرط پہ محفل میں کہ بے ہوش رہوں
ہوش میں آؤں تو محفل سے اُٹھادیں مجھکو

محرمِ گوش ہوں ہم رُتبۂ گوہر نہ سہی
اختیار آپ کا رکھیں کہ گنوادیں مجھکو

میں اور آسودگیٔ مرگ، فقط وہم ہے یہ
لذّتِ ہجر میں جلنے کی دُعا دیں مجھکو

اب وہ لہجہ وہ نظر اور بھی یاد آتی ہے
تم نے کِس دل سے کہا تھا کہ بھُلادیں مجھکو

شمع ہوں، بزم نشیں لذّتِ گریہ کے لئے
اشک آنکھوں سے نہ ٹپکے تو بجھادیں مجھکو

ساز کہتے ہیں کہ عالم میں لُٹادیں تیرے راز
دَرد بنتا ہے کہ پَردوں میں چھُپادیں مجھکو

جن کے صدقے میں ہوا صاحبِ ایماں یارب
وہ سیہ پوش ہی کافر نہ بنادیں مجھ کو!

اے دل اب اور کوئی قصۂ دنیا نہ سنا
چھیڑ دے ذکرِ وفا، ہاں کوئی افسانہ سنا

غیبتِ دہر بہت گوشِ گنہگار میں ہے
کچھ غمِ عشق کے اوصافِ کریمانہ سنا

کارِ دیروز ابھی آنکھوں سے کہاں سمٹا ہے
خوں رُلانے کے لیے قصۂ فردا نہ سنا

دامنِ باد کو ہے دولتِ شبنم کافی
رُوح کو ذکرِ تنک بخشیٔ دریا نہ سنا

سنتے ہیں اُس میں وہ جادو ہے کہ دل چیز ہے کیا
سنتے ہیں اُس پہ وہ عالم ہے کہ دیکھا نہ سنا

گوشِ بے ہوش وہ کیا جس نے کہ ہنگامہ لیا
کوئی نالہ ہی لب نے سے نکلتا نہ سُنا

ہمنشیں پردگیٔ راز لطے سے کہتے ہیں
لبِ ساغر سے کسی رند کا چرچا نہ سُنا

کچھ عجب چال سے جاتا ہے زمانہ اب کے
حشر دیکھے ہیں مگر حشر کا غوغا نہ سُنا

بڑھ گیا روزِ قیامت سے شبِ غم کا سکوت
جسمِ آدم میں کہیں دل ہی دھڑکتا نہ سُنا

نوحۂ غم کوئی اُس بزم میں چھیڑے کیونکر
جس نے گیتوں کو بھی باخاطرِ بیگانہ سُنا

کیوں مٹیں دشمنیٔ دہر سے ارماں میرے
حسرتیں زندہ مری، درد فراواں میرے

نہ سہی گو یہ گلستان و دبستاں میرے
پھر بھی کیا کم ہے جو رہنے دو بیاباں میرے

شرطِ رخصت نہ تھی آثارِ سحر سے پہلے
ڈوبتے چاند، رفیقِ شبِ ہجراں میرے!

کتنے کانٹے تھے کہ دل سے نہ نکالے جاتے
کر گئی کام بہت عمرِ گریزاں میرے

کیا گلہ تم سے کہ وعدے نہ نبھائے اپنے
یہ بھی کیا کم ہے کہ سب یاد ہیں پیماں میرے

اُٹھ سکیں گے یہ ترے مُفت کے احساں کس سے
اس قدر زعمِ وفا ہائے دلِ ناداں میرے!

گردشِ دہر یہ روزینہ رنجش کب تک
ہاں کوئی تحفۂ غم شان کے شایاں میرے

کوئی دھڑکن نہ خلش، خیر تو ہے حضرتِ دل
آپ ایسے ہی بڑے تابعِ فرماں میرے

بتکدے میں تھے صنم دشمنِ جان و ایماں
ہوں جو کعبے میں تو درپے ہیں مسلماں میرے

موت کیا آئے گی، ہاں راہِ وفا میں شاید
کام آجائے کوئی حسرتِ پنہاں میرے

ہائے وہ اس کی نگاہوں کے کھلائے ہوئے پھول
خاک ہونے کو بنے حسرت و ارماں میرے

مجھ کو اک رخصتِ فریاد بہت ہے حقّی
تاقیامت رہیں احبابِ غزلخواں میرے

ہم جلوہائے دہر سے نا آشنا نہیں
گو دل میں تم ہی تم ہو نگاہوں میں کیا نہیں

کیا دل مزاجِ دوست کو پہچانتا نہیں
یہ اور ہی فسوں ہے فریبِ وفا نہیں

اے دورِ بے اماں مرے نقشِ وفا کی خیر!
یہ وہ صنم ہے جس کو کوئی پوجتا نہیں

ہے التجا کہ غیر سے ترکِ حجاب کر
ناحق مری نگاہ سے کیوں سامنا نہیں

دل کو یہ شرکتِ کس و ناکس نہیں قبول
سب جس کو پوجتے ہوں وہ اپنا خدا نہیں

غیروں کا پائمال نہیں عرصۂ خیال
اِس رہگزر میں ایک بھی آوازِ پا نہیں

وحشت پہ میری عرصۂ نظارہ تنگ تھا
دیکھا مگر تو دل میں بھی کافی فضا نہیں

ہر کارِ شوق بن ترے اک جبرِ ناگوار
فریاد ہے کہ نغمۂ دل میں مزا نہیں!

راہ بتلانے والوں کو نیند آگئی
تھک گئے خستہ حالوں کو نیند آگئی

دیکھنا تو ذرا انجمن کا سکوت
جیسے سب ہمخیالوں کو نیند آگئی

یوں ہیں آسودہ شانوں پہ گیسو ترے
جیسے آشفتہ حالوں کو نیند آگئی

دیر سے بزمِ اذکار میں ہم سخن!
خامشی ہے خیالوں کو نیند آگئی

جھومتے ہیں تہِ شاخ دار اے چمن
لے ترے نونہالوں کو نیند آگئی

بے اثر کب رہی داستانِ وفا
جب چھڑی سننے والوں کو نیند آگئی

ختم تھا خاشی پر کمالِ سخن

سارے صاحب کمالوں کو نیند آگئی

رہ گئیں حسرتیں گوشِ مشتاق کی

داستاں کہنے والوں کو نیند آگئی

گو نہ دیکھے کبھی جھک کر سرِ عالی میرا
داغِ حسرت سے گریباں نہیں خالی میرا

یوں کسی سمت اندھیروں میں رواں ہوں جیسے
منتظر ہو کوئی خورشیدِ خیالی میرا

ہمکلامی کی نہیں شرط ہم آغوشی کو
گوشِ بیگانہ نہیں پہلوئے خالی میرا

رہ گئی حرفِ سیہ بن کے لہو کی سرخی
اتنا بے رنگ نہ تھا نقشِ خیالی میرا

بارِ گردوں سہ رہی ٹوٹ کے دم بھر میں دھنک
اور شے ہے درِ سے خانۂ عالی میرا!

داد ملتی ہے زمانے سے ترے درد کی یوں
جیسے ہو یہ کوئی مضمونِ خیالی میرا

جس طرف دل کو رہی چشمِ کرم کی امید
اُس طرف بڑھ نہ سکا دستِ سوالی میرا

مجھ سے کہتا ہے مرا حال دکھا کر غمِ عشق
اِس گلستاں میں نہ لے اسمِ جلالی میرا

خلد میں بھی ہے یہی حوصلۂ شیخ کا رنگ
بھر دے دامن کوئی ٹوٹی ہوئی ڈالی میرا

بارِ محفل ہے یہ دھیمی سی فغاں بھی جعفری
ورنہ کچھ اور ہی تھا طرزِ مثالی میرا

یوں کہاں ہوتی ہے اک موجِ نفس میں یہ کھٹک
اے خوشا حرف کہ پہنچے لبِ اعجاز تلک!
بن گئی یونہی سخن میں تو ذرا نوکِ پلک
میرے لہجے میں کہاں ہو مرے سینے کی کھٹک
سامنے رہتی ہے یوں اک تری نازک سی شبیہہ
لوٹ جاتی ہے اگر آنکھ بھی جاتی ہے جھپک
دل کی ہمت سے ہیں کیا کیا گلِ خوش رنگ نصیب
میرے دامن پہ بھی ہے کچھ ترے آنچل کی جھلک
نام نے اُس کے دکھائے ہیں کرشمے کیا کیا
مُنہ سے نکلے تو مہک ہاتھ سے لکھیے تو دمک
یوں دعا مانگ کے شرمندہ ہوں دل میں جیسے
تیری خاطر سے درِ غیر پہ دی ہے دستک

بے مزا کر کے رہی دل کو وہ پھیکی سی ہنسی
لب کو چھو بھی نہ گیا چہرۂ زیبا کا نمک

دیکھے محفل میں تری جنبشِ لب کے انداز
وہ بھی کیا خوب سخن تھے جو نہ پہنچے ہم تک

غارتِ عشق میں تخلیق کے پہلو نکلے
خوب کاغذ پہ گئی نقش بنا کر دیمک

ذکرِ خوباں ہی سے ہوتا ہے سرِ حرف آغاز
آ پہنچتا ہے جو غفلت میں بیانِ دل تک

فائدہ بات بنانے سے کہ آخر دل پر
تیری حجّت نہ چلے گی ترا دعویٰ بے شک

اپنی یادوں پہ بھی اب اُس نے لگا دی بندش
نام لینے سے خفا۔ ذکر سے ہوتی ہے ہتک

شور و ہنگامۂ ہستی کی مسلسل یورش
سب بھلا دیتی ہے اک آن میں ساغر کی کھنک

خود ہی دامن پہ چمک اٹھتا ہے گوہر کوئی
نگہ عشق کو آتی ہے کہاں چھان پھٹک

کرم آمیز ہوتی ہے ستم کی ہر ادا کیسی
وہی اک چشمِ غارت گر بنی ہے دلربا کیسی

سراپا گوش ہیں لیکن ہمیں تک آ نہیں سکتی
بھٹکتی ہے اندھیروں میں تری آوازِ پا کیسی

خرد بھی ہو گئی آخر جنوں کی ہمنوا شاید
دبستانوں سے آتی ہے سلاسل کی صدا کیسی

یہ باتیں دل سے مت پوچھو کہ وہ چشمِ حیا پرور
کبھی خلوت میں کرتی ہے نظر کا سامنا کیسی

حقیقت ایک تصویرِ خیالی رہ گئی گویا
ڈھلی جاتی ہے نغموں میں کسی کی ہر ادا کیسی

وہی ہے چشمِ نم اور حسرتِ فصلِ نمو حقی
نہ سمجھے تھے کہ پتھر ہے زمیں زیرِ پا کیسی

نو آہنگ

مختصر نظمیں



محفلِ شب

چمن ہے چاندنی ہے ہمنفس بھی — ہوا میں گھول دو نغموں کا رس بھی
کبھی جن سے کیا تھا پیار دل نے — وہی کلیاں کھِلی ہیں اِس برس بھی
نئی رُت ہی نئی رتیں نئے رُوپ — نکھرتے جا رہے ہیں خار و خس بھی
وہ چھیڑا دل نے اک تازہ سا نغمہ — کہ تازہ ہو گیا نَے کا نفس بھی
نہ پوچھو جھومتی تانوں کا جادو — بھڑک کر رہ گئی پھولوں کی نس بھی
کسی کی لَے میں ہیں امرت کی لہریں — مرے ہاتھوں میں سازِ خوش نفس بھی

صدا کے سوز پر سازِ دل کے چھینٹے   گئے اب تک کئی بادل برس بھی

نکلتے ہیں غزل کا رُوپ بھر کر

مرے سینے سے کچھ رنگیں نفس بھی

نہ آئے تم گئیں کلیاں بِکَس بھی   ہوائیں لے اُڑیں پھولوں کا رس بھی

نہ ہو جب خود پہ قابو دل پہ بس بھی   تو کیوں ہو یہ نگاہ نیم رس بھی

بہاریں کر گئیں آزادِ دامن   یہیں تک تھی جنوں کی دسترس بھی

مجھے اٹھتی نظر آتی ہے اب تک   دلوں سے ایک آہِ بے نفس بھی

یہ کس کو ڈھونڈتی ہے دل کی فریاد   خدایا ! ہے کوئی فریاد رس بھی

نہ ہو مایوس مجھ سے چشمِ ایام   ابھی تو غم بھی ہے غم کی ہوس بھی

نفَس باقی ہے گر ہونٹوں پہ آئے دل
تو مل ہی جائیں گے کچھ ہمنفس بھی

کہیں شعلہ بھی ہے خرمن بھی خس بھی
نظر کو ہے تماشے کی ہوس بھی

صلاحِ دل کہو اے ہمصفیرو
کہ کب کا کھُل چکا بابِ قفس بھی

چلا تھا قافلہ منزل کی جانب
سُنی تھی میں نے آوازِ جرس بھی

یونہی بڑھتا رہے منزل بمنزل
یونہی چلتا رہے لاکھوں برس بھی!

شریکِ ہاؤ ہوئے محفلِ شب
سے ہے میری نوائے تازہ رس بھی

۱۹۵۱ء

شگوفۂ خزاں

عینِ بعدِ بہاراں کھلی اک کلی
گو نگارِ بہاراں کے شایاں نہ تھی
زینتِ شاخِ گل، جانِ گلشن بنی

اک مسافر تھا گویا پسِ کارواں
خاکِ گلشن میں سوزِ نمو کا نشاں
کھینچ کے آئی تھی صحرا کی روحِ جواں

درمیانِ سحاب اک ستارہ سا تھا
زیرِ خاشاک و خاک اک شرارہ سا تھا
چشمِ تقدیر کا اک اشارہ سا تھا

ایک دل تھا کوئی جس کا ساتھی نہ تھا
اک ذہن ہمنوا جس کا کوئی نہ تھا
اک نظر تھی، کوئی ہمنظر بھی نہ تھا

یوں کھلی وہ، سحر مسکرانے لگی
شاخ جھومی، صبا گنگنانے لگی
روئے گلشن پہ رنگت سی آنے لگی

پھر اِدھر سے اُدھر اک خبر سی چلی
جھاڑ جھنکاڑ میں مچ گئی کھلبلی
بولے آئی کہاں سے یہ کرموں جلی

خار کہنے لگے بن کو پھونکے گی یہ
فتنۂ دہر ہے حشر ڈھائے گی یہ
زخمِ گلزار ہے خوں رُلا دے گی یہ

ٹھنڈ بگڑے کہ یہ شاخسانہ ہے کیا
یہ بھی ذوقِ نمو کا زمانہ ہے کیا
ہم کو بن پھونکنا گھر لٹانا ہے کیا

جھاڑ کانٹے بڑھے خشک پتے اٹھے
خاک تودے چلے لُو کے لپکے اٹھے
حامیانِ چمن کیسے کیسے لٹے!

وہ کھلی اور نہ جانے کہاں کھو گئی
اشکِ خوں دامنِ دشت میں بو گئی
آخری شمعِ گلشن کی گُل ہو گئی

اب یہ چرچا ہے اک دن پھر آئے گی وہ
لاکھ چنگاریاں ساتھ لائے گی وہ
دیکھنا بن کا بن پھونک جائے گی وہ

۱۹۵۸ء

قدرِ مشترک

جانم تمہارے روئے دلآرا میں ہے جو بات
سیمائے مہ میں پھول کے رخسار میں بھی ہے
پایا اسی کو میں نے تمہاری وفا میں بھی
شاید مری نظر میں مرے پیار میں بھی ہے
اس شے کی ہے ہماری امیدوں میں بھی نمود
یہ شے ہمارے جذبۂ بیدار میں بھی ہے
روشن اسی کے دم سے ہیں شام و سحر مرے
پرتوِ اسی کا کچھ مرے افکار میں بھی ہے
ملتی ہے پچھلی رات کی سرگوشیوں میں بھی
آغازِ شب کی گرمیٔ گفتار میں بھی ہے

وابستہ ہے حیات کے معصوم جہد سے
ڈھونڈو اگر تو کوچہ و بازار میں بھی ہے
ہوتی ہے گاہ رامشِ سیف و سپر میں بھی
دیکھو تو شور و مستیٔ میخوار میں بھی ہے
یہ سرکشوں کی ہمّتِ خاراشکن میں بھی
یہ منکروں کی جراَتِ انکار میں بھی ہے
میں آشنا خودی سے نہ واقف خدا سے ہوں
اس قدرِ مشترک کا پجاری سدا سے ہوں

۱۹۴۱ء

فن

سیکڑوں خواب محبت کی نظر نے دیکھے
سو مرے دیدۂ بیدار کے کس کام آئے؟
ان کہے بول جو راتوں کو صبا نے بولے
وہ مرے گوشِ طلبگار کے کس کام آئے؟

ہیں بہت شوق کی دنیا میں فسانے ارزاں
آشنا جن سے نگاہیں نہیں ہونے پائیں
کتنے پیکر ہیں خلاؤں میں نظر کے رقصاں
جلوہ گر جن کی ادائیں نہیں ہونے پائیں

چُنتی پھرتی ہے نظر خواب کے رنگیں ریزے
جو کہیں خاک کے ذرّوں میں نہاں ہوتے ہیں
سیکڑوں خوابوں کی لڑیوں کو پروتا ہے خیال
تب کہیں اشک کی صورت میں عیاں ہوتے ہیں

اشک ہی شوقِ زیاں کار کا حاصل ٹھہرے
یہ بھی اے دل مرے غمخوار کے کس کام آئے؟
مٹ گئے، دوست نہ اغیار کے قابل ٹھہرے
آج چمکے بھی تو کل یار کے کس کام آئے؟

خود ابھی جہدِ نمو میں ہے جہانِ گزراں
خواب نے پائی ہے یونہی سی حقیقت کی جھلک
چھن کے آتا ہے بمشکل کوئی نقشِ تاباں
کیف سے رنگ تلک رنگ سے احساس تلک

ہے وہی نقشِ نظر نقشِ حقیقت یارو!
جو صنم خانے کی دیوار کے کام آجائے
ہم تو کہتے ہیں صبا قطرۂ شبنم اُس کو
جو کسی نرگسِ بیمار کے کام آجائے

۱۹۵۸ء

آخری دیدار

شمع کی لو کو بڑھانا کہ بجھی جاتی ہے
ڈھونڈھتی ہیں کسی صورت کو نگاہیں میری
بزم کا آخری نظّارہ تو کرنے دو مجھے
اِن ترستی ہوئی نظروں سے نہ جاؤنگا کبھی
حُسن کی ایک جھلک اور دکھا دے کوئی

سُست کیوں وقت کی رفتار ہوئی جاتی ہے
رقصِ افلاک ٹھہرتا نظر آتا ہے مجھے
کیوں زمانے کا قدم تیز نہیں ہو جاتا

کچھ بہت دور نہیں منزلِ فردا لیکن کاش
آنکھ سے پردۂ تقدیر اُٹھا دے کوئی!

چھایا جاتا ہے خمار آنکھ لگی جاتی ہے
ہیں نگاہیں مری اک ظلمتِ ذخّار میں گم
دہر کا آخری دیدار یہی ہے شاید
ہاں کوئی اِس شبِ تیرہ کی سحر ہے کہ نہیں
وہ سحر ہو تو مجھے کاش جگا دے کوئی!

۱۹۴۲ء

آندھی

میں رُوحِ رقص و نغمہ ہوں
رواں دواں، غمیں حزیں
بھٹک کے خاک و باد و شور و زور و ضرب بن گئی
دلوں کا درد بن گئی . بدن کا کرب بن گئی
میں روشنی تھی آگ ہوں
میں بانسری تھی ناگ ہوں
نہ رنگ ہوں نہ راگ ہوں
لُٹا ہوا سہاگ ہوں
یہ کس کے قہرِ بے اماں سے رُوئے چرخ زرد ہے
جنوں جو قیدِ دشت میں تھا اب جہاں نورد ہے

میں جوئے نغمہ بار تھی
میں صوتِ آبشار تھی
جمالِ سبزہ زار تھی
جلالِ کوہسار تھی
میں شہر گشت ہوں کہ مجھ پہ سبزہ زار بند ہیں
وہ جوئے نغمہ رک گئی وہ آبشار بند ہیں

میں حسرتِ تباہ ہوں
میں زیست کی کراہ ہوں
جلے دلوں کی آہ ہوں
ستم کی دادخواہ ہوں
یہ وحشتیں یہ ولولہ جو غارتوں پہ صرف ہے
رہے جو اپنے ظرف میں بہارِ باغ و طرف ہے

بھٹک رہی ہے رُوحِ عشق
گُم ہے وادئ خیال
عذاب بن کے رہ گیا
وہ سوز و ساز و وجد و حال

نسیمِ صبح بادِ تند و تیز سے بدل گئی
رواں کرو جوئے سخن کہ کشتِ زیست جل گئی

یہی فنا کی اصل ہے
یہی بقا کا راز ہے
جنوں ہی تیشہ ساز ہے
جنوں ہی شیشہ ساز ہے

تصادمِ نگاہ سے برس پڑیں نہ بجلیاں
بچو کہ سخت شعلہ گیر ہیں یہ خشک کھیتیاں!

۱۹۵۸ء

اُمِّ آدم

یوں تو نخچیر بنایا جسے چاہا میں نے
وہ تڑپنے بھی نہ پایا جسے "چاہا" میں نے

اہلِ دل اپنے جو پھرتے ہیں سنبھالے ہوئے دل
اُن کے سینوں میں ہیں سب میرے ہی ڈھالے ہوئے دل
گُل بنے میرے لہو سے کبھی لالے ہوتے دل!
ہیں مرے نازِ مرے پیار کے پالے ہوئے دل
درد آموز بھی ہوں درد کی ماری بھی ہوں
میں صنم بھی ہوں صنمگر بھی پجاری بھی ہوں

میں ہوں پامالِ جہاں اور جہاں کی زینت
میں ہوں محرومِ وفا اور جہانِ اُلفت
دیکھیے حشر میں ہو کس سے سوالِ قُتِلَت
مامتا رشک خطا صبر محبت نفرت
جیتے جی آگ میں کیا کیا نہ جلایا مجھکو
میں یہ پوچھوں گی کہ کس جرم پہ بخشا مجھکو

صنفِ اولیٰ ہوں میں آدم سے بڑی ہے مری ذات
خلد سے میں نے ہی دلوائی تھی آدم کو نجات
میرے ہی دم سے چلا سلسلۂ سوزِ حیات
کام آئی تھیں رہِ شوق میں میری ہی صفات
میری باتیں مری گھاتیں مری چالیں مرے کید
نیم غمزے میں بنا لیتی ہوں صیاد کو صید

اپنے ہر روپ میں اک نقشِ مثالی ہوں میں
ڈھونڈیئے مجھ کو تو تصویرِ خیالی ہوں میں

گو بہت دل کا کہا ماننے والی ہوں میں
کون کہتا ہے کہ تدبیر سے خالی ہوں میں
دل کی باتیں کہیں کانوں سے سنی جاتی ہیں
یہ کسی اور سلائی سے بُنی جاتی ہیں:

o

"دشمنوں" کو مری بچی کے ابھی تک ہے بخار"
"سانچ کو آنچ نہیں جھوٹ پہ اللہ کی سنوار"
"جانے کب تک رہے سسرال مرے سر پہ سوار"
"واہ وا ! پلکیں بھی ہوتی ہیں کہیں آنکھ پہ بار
"ہنس بھی دو، فال نہ کھلواؤ، پکڑ لی چوری"
"ہنستے ہی بستے ہیں گھر" بوجھ پہیلی موری:

۱۹۵۸ء

دُہائی

ہے دہائی کہ بہاروں نے چمن پھونک دیا

پڑتے ہیں متوالی رُت کے بہکے بہکے پاؤں
دیس اُجاڑے دوار اُجاڑے پھونکے کتنے گاؤں
آتشِ خار نے پھولوں ہی کا تن پھونک دیا

چال اَٹکھیلی، دھوم مچائے کوسوں کوس دہائی
رُوپ سجیلا گُن ہیں کالے رات یہ کیسی آئی
چاندنی رات نے تاروں کا چمن پھونک دیا

بوٹے من کی پھلواری کے کھلتے ہی مرجھائے
جو برسائے آگ ہم ایسی برکھا سے بھرپائے

بزم حسرت کا سب آراستہ پن پھونک دیا

آنکھیں کھول کے دیکھ دوالی بیچ اندھیرا گھور
دیپ جلائے لوٹ رہے ہیں کیسے دھاڑی چور
دیکھ دنیا نے غریبوں ہی کا دھن پھونک دیا

جلتا جیون جگمگ سپنے دیکھے اور رو دیئے
کیا پھولے وہ دوالی جس کو آس ہی ہار آئے
جیون کا ہے کی مناؤں ، مرا من پھونک دیا

۱۹۵۱ء

مشین

رواں ہے رواں ہے رواں ہے مشین
عناصر کے جوہر جگاتی ہوئی
عجائب کو ارزاں بناتی ہوئی
ترقی کی تانیں اُڑاتی ہوئی
نئے دَور کا راگ گاتی ہوئی

شیاطیں کو تسخیر کرتی ہوئی
مجانیں کو زنجیر کرتی ہوئی

رواں کارِ تقدیر کرتی ہوئی
نئے عہد تعمیر کرتی ہوئی

زمانے سے بازی لگاتی ہوئی
بلاؤں کا بَل آزماتی ہوئی
مُحالوں کو ممکن بناتی ہوئی
خوارق کے خاکے اُڑاتی ہوئی

اشاروں پہ دولت کے چلتی ہوئی
جوانوں کا خوں پی کے پلتی ہوئی
اُدھر لعل و گوہر اُگلتی ہوئی
اِدھر ڈنک چھاتی پہ دلتی ہوئی

رواں ہے رواں ہے رواں ہے مشین

ورق روز و شب کے اُلٹتی ہوئی
سفیدی سیاہی کو بٹتی ہوئی

کہیں کچھ الٹتی پلٹتی ہوئی
کہیں کچھ سمجھتی سلٹتی ہوئی

عمل کے کرشمے دکھاتی ہوئی
قدامت کی چولیں ہلاتی ہوئی
رلاتی جلاتی چڑھاتی ہوئی
کچلتی مسلتی مٹاتی ہوئی

رواں ہے رواں ہے رواں ہے مشین

مکمل، منظم دروبست ہے
عجب دور میں دور پیوست ہے!
کوئی اوج پر ہے کوئی پست ہے
یہ رقصاں ہے جولاں ہے سرمست ہے
رواں ہے رواں ہے رواں ہے مشین

۱۹۴۸ء

منچلے

جب جان پہ اپنی ہم کھیلیں
جو ہاتھ پہ دھر دو کیوں لے لیں
جب بڈّیاں رات اور دن بیلیں
پھر روز کے فاقے کیوں جھیلیں

ہاں فوج پُلس بلوانے دو
جاتی ہے جان تو جانے دو
غیرت پر آنچ نہ آنے دو
مظلومو ! آن نہ جانے دو

سب ہو کر ایک جب اٹھیں گے
پتلونیں ڈھیلی کر دیں گے
ہم جیتے ہیں ہم جیتیں گے
کیا چیز ہے دولت دیکھیں گے

یہ جتنے گورے کالے ہیں
سب اپنے دیکھے بھالے ہیں
سب دولت کے رکھوالے ہیں
سب مایا کے متوالے ہیں

پنڈت ہو کوئی یا مولانا
چالوں میں کسی کی مت آنا
خاطر میں کسی کو مت لانا
باتوں پہ کسی کی مت جانا

کب فاقوں سے ہم ڈرتے ہیں
ہم یوں بھی فاقے کرتے رہیں
برسوں ہی سے بھوکے مرتے ہیں
جنموں ہی سے جوکھوں بھرتے آئیں

یوں کون سنے اور کون کہے
یہ ظلم یہ ذلّت کون سہے
یوں دھار کے رُخ پر کون بہے
اب کس کی رہی اور کس کی رہے!

۱۹۳۸ء

نذرِ حسینؑ

اگرچہ تسکینِ دل کی خاطر ہوا ہے ایما کہ "لا تقولوا"
مقامِ دل رفتگی میں لیکن کسے گوارا ہے خود پہ قابو

یہ کارِ نفع و زیاں نہیں ہے، سُن اے شناسائے دردِ پہلو!
نفس کی راحت ہیں چند آہیں، نظر کی دولت ہیں چند آنسو

ملے کسی کو تو زندگی میں عجیب شے دل کا چین بھی ہے
مگر مبارک وہ دل کہ جس کو نصیب دردِ حسینؑ بھی ہے

گواہ ہیں داغِ دل کہ یہ غم فقط کہانی نہ ہو سکے گا
یہ نقشِ جاں آفریں شریکِ نقوشِ فانی نہ ہو سکے گا

فلک سے برسے گی آگ، پیدا زمیں سے پانی نہ ہو سکے گا!
میں اُس کے جبروت پر فدا ہوں کہ جس کا ثانی نہ ہو سکے گا

یہ سر جھکے گا نہ پیشِ باطل، وہ اور ہیں سر جھکانے والے
سلام تجھ پر جہانِ باطل کو جرأتِ حق دکھانے والے!

سمجھ رہے تھے کہ سیلِ ہمت فرات تک آ کے تھم رہے گا
کسے خبر تھی یہ خونِ ناحق زمیں کے دامن پہ جم رہے گا

یہی وقارِ عرب ہے اب تک، یہی نجاتِ عجم رہے گا
دلوں میں دائم یہ درد ہو گا، یہ داغ ہو گا، یہ غم رہے گا

ضمیرِ ہستی میں یاد تیری دبی ہے خیر الاصول بن کر
جو جذبِ دامن ہوں تیرے غم میں وہ اشک کھلتے ہیں پھول بن کر

۱۹۵۲ء

★

دھیان

آنکھ کے آگے عالم پل پل مٹتا بنتا جائے
جانے کون بگاڑے ہے اور جانے کون بنائے
اک دھڑکن سے اک دھڑکن تک باقی کیا تھا؟ دھیان!
پل بھی ٹھہرے سانس بھی ٹھہرے دھیان ہی دوڑا جائے

اپنی ہی پرچھائیں کے پیچھے پاگل دوڑا جائے
دھیان ہی بھید اور دھیان ہی بھیدی پھر کہیئے کیا پایا؟
پایا کیا ہے؟ آنکھ کے اندر اک بندی بھر رنگ
ہم چیلے اُس سادھو کے جو من کا بھید بتائے

نذرِ میرؔ

کہانی تھی تری بے قیدِ ایّام — زبانِ خلق پر اب بھی ہے جاری
ترے دردآشنا دل کی ابھی تک — زمانہ کر رہا ہے غمگساری

بہت چنگاریاں برسا گئی ہے — تری آہِ جگر کی شُعلہ باری
تری گفتار کا ایک ایک نشتر — کلیجے کے لئے ہے زخمِ کاری
کمالِ عشق سے حاصل ہے تجھ کو — جمالِ یار کی آئینہ داری
مبارک اختلاطِ حسن و اُلفت — سلامت جذبِ دل کی کامگاری

بہاراں کر گئی کشتِ غزل کو — ترے اشکِ رواں کی آبیاری
تری ہر سردِ آہِ صبحگاہی! — سخن کے واسطے بادِ بہاری
خدا سے مانگ لی تیرے سخن نے
زمینِ شعر کی پروردگاری — ۱۹۴۰ء

★

وہاں ملی ہے مجھے اک حیاتِ نیم نفس
جہاں فضاؤں میں پھیلے ہیں روشنی کے برس
یہ خوابناک خموشی یہ خلوتِ پُرہول
یہ اجنبی سی فضائیں یہ سرد سرد ماحول
یہ رنگ رنگ اندھیرے یہ تابناک غبار
یہ پُر بہار بیاباں یہ بے خروش دیار
یہ ایک نکتۂ بے کیف و کم کی پہنائی
یہ کائنات کی اک نا تمام انگڑائی...
ادھر یہ درد کے طوفاں یہ حسرتوں کے سراب
یہ جگمگاتے تصور یہ جیتے جاگتے خواب
نوائے محبتِ رنگیں سخن کے شوخ شرار
یہ ایک جوہرِ دل کی شعاعِ بے زنہار...
خرامِ دہر سے آگے ہے کاروانِ نفس
بھٹک رہے ہیں خلاؤں میں روشنی کے برس

قطعات

کرتا ہوں خونِ دل کو ریاضِ سخن پہ صرف
دولت مری یہ جوہرِ ناساز ہی تو ہے
کچھ اِس طرح سے ہوں ہمہ جاں نغمہ آفریں
جیسے زمانہ گوشِ برآواز ہی تو ہے!

شاعر

اہلِ معنی کا تقاضا ہے کہ پیغام کوئی
امتِ عشق کا کہنا ہے کہ ابہام کوئی!
اک ذرا سیرِ صنمخانۂ حیرت ہی سہی
نغمۂ ہوش رُبا لائے دلِ ناکام کوئی!

سخنِ دل میں وہ انداز کہاں سے لاؤں
میں ترے لب کا سا اعجاز کہاں سے لاؤں
بن ترے گیت تو لکھ جاؤں بہت سے لیکن
تیرا نغمہ تری آواز کہاں سے لاؤں!

میرے خیالِ سادہ کا سرمایہ کچھ نہیں
دل میں سوائے حسرتِ بے مایہ کچھ نہیں
اک عمر گزری شوق کا پیرایہ ڈھونڈتے
دیکھا تو عرضِ شوق کا پیرایہ کچھ نہیں

چاندنی رات کے طوفان نے گھیرا ہے مجھے
تو نے اے دل یہ کہاں لا کے ڈبویا ہے مجھے!
گوشۂ چشم میں تھا اشک کی صورت غمِ حسن
اب دھواں دھار برستا نظر آتا ہے مجھے

حسن تو آؤ مری روح میں حل ہو جاؤ
نغمہ و اشک بنو حرفِ غزل ہو جاؤ
میری تخئیل کی ممتاز حسیں محرابو!
یادگارِ غمِ دل، تاج محل ہو جاؤ

حرف میرا ہے نقشِ نو ایجاد
میرا نغمہ ہے نغمۂ نو رنگ
میرے سازِ طرب سے ملتی ہے
قلبِ ہستی کی ضربِ نو آہنگ

رند

میری ہستی تمام مست و خراب   میری دنیا تمام غرقِ شراب
ہاں بہت صاف و سہل برائے دوست   میرے اعمالِ خستہ کا حساب

خلشیں بے حساب ہیں اب بھی
خوب گہرے حجاب ہیں اب بھی
جستجوئے نگاہ کا ساماں
وہی جام و شراب ہیں اب بھی

اور غرقِ شراب ہونے دو
خوب دل کو خراب ہونے دو
مجھ کو تسلیم ہے شکستِ نگاہ
ہر حقیقت کو خواب ہونے دو!

مصوّر

یہ مرے دل کا مرقع ہے کہ تیری تصویر   خوب لکھی ہے تخیل نے شکستہ تحریر
دل نے تفریقِ من و تو نہ رکھی تھی باقی   آنکھ کم بخت ابھی تک ہے لکیروں کی فقیر

نغمہ

کھنچی آتی ہے دل میں روحِ نغمہ
صدائیں سازسے چھَن چھَن کے نکلی
ٹھہر کر سینۂ سوزاں میں دَم بھر
ہوا کی موج بجلی بَن کے نکلی

جانِ نغمہ تری حسیں آواز		لاکھ روپ اختیار کرتی رہی
میرا نیرنگِ آرزو بن کر		بے خود و بے قرار کرتی رہی

مطربہ تیرا نغمۂ رنگیں		دل کو بے اختیار کرتا رہا
میں نے دیکھا کہ اک حسیں پیکر		تیرے ہونٹوں کو پیار کرتا رہا

آسمان

بڑھ رہی ہے فضا کی تاریکی		رُوح کو وحشتوں نے گھیرا ہے
لاکھ عالم نظر میں جاگ اٹھے		آسماں آج بھی اندھیرا ہے

گناہ

گھڑ لئے ہیں خودنے اسیری نے کچھ صنم
جھوٹا قرار جن سے کیا ہے نباہ کا
دنیا میں خود فریبیِ انساں کی بے مثال
ایجاد ہے کوئی تو تصوّر گناہ کا

اسیر رہ نہ سکی میری فطرتِ آزاد
قیودِ رسمِ زمانہ کو توڑتے ہی بنی
یہ سوچتا ہوں بنا اِن رسومِ رسوا کی
مذاقِ برہمنی تھا کہ شوقِ بت شکنی!

ایٹم بم

وہ جن کی کہ ذرّات کے دل تک ہے رسائی
صد حیف کریں یوں درِ دولت کی گدائی
شیطاں سے خدائی کے سب اسرار تو سیکھے
افسوس کہ اک جرأتِ انکار نہ پائی

ستم ایجادیٔ حکمت نہیں دیکھی جاتی
علم کی تازہ کرامت نہیں دیکھی جاتی
مجھ سے تہذیب کی رفتار کا احوال نہ پوچھ
مجھ سے تہذیب کی صورت نہیں دیکھی جاتی

ہے عبث، دوست! ذکرِ ایٹم بم
بات پلّے تری پڑی بھی نہیں!

وزن اس کی دلیل [illegible]
ہاتھ میں جس کے اک چھڑی بھی نہیں

آسیب

جہاں میں ظلمتِ شاہی نے بن کے ظلِ الٰہ
روا رکھے ہیں جو اندھیر کہہ نہیں سکتے
مگر پکار کے کہہ دو کہ روحِ افلاک
کہ اب نصیب پہ یہ آسیب رہ نہیں سکتے

قضائے محکم

زمانہ مُڑ نہیں سکتا کبھی ازل کی طرف
حیات اپنے منازل بدل نہیں سکتی
جہانِ تازہ نصیبِ نگاہ ہو کے رہے
قضائے حضرتِ انساں ہے ٹل نہیں سکتی!

راز

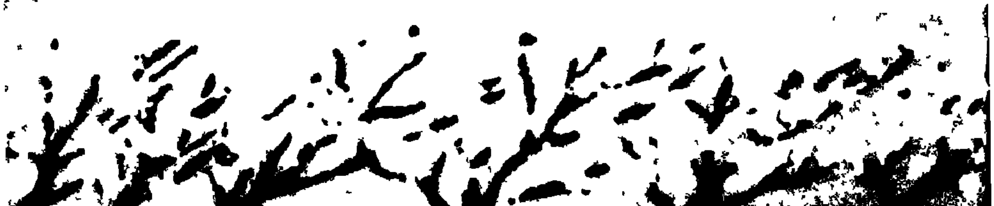
پوچھتی ہے کبھی حیرت سے مری چشمِ نیاز
جانے کس چیز سے بنتا ہے یہ جسموں کا گداز
عشق کا نقد عیاں ہے ہمہ حسرت ہمہ شوق
حُسن کا گنجِ نہاں ہے ہمہ راز و ہمہ راز

فرصت

زندگی اے جہانِ دیر پسند
اہلِ دل پر ہی کیوں حرام ہوئی
کوئی دیا جلا کہ آئی صبح
کوئی غنچہ کھلا کہ شام ہوئی

نغمۂ جولاں

ہیئت و آہنگ کے چند تجربے



عنا ئمۃ

تازہ بستیاں

عیدِ آزادی ہے، غمِ رخصتِ رم لیتا ہے
کاروان چشمۂ جاں بخش پہ دم لیتا ہے

ہمدمو مژدہ کہ وہ صبحِ سعادت آئی
رُوح میں جس کی تجلّی سے حرارت آئی

خاطرِ خستہ کو پھر اذنِ فراغ آپہنچا
راہِ ظلمت میں ہدایت کا چراغ آپہنچا

توڑ کر قوم نے اک کہنہ نظام آج کے دن
ہاتھ میں لی تھی مقدر کی زمام آج کے دن

آج ہے روز مسرت اثرِ استقلال
مل گیا قوم کو گویا ثمرِ استقلال

دُور ہر دل سے غمِ دوریٔ منزل ہے آج
سوزِ دل خود ہی چراغِ سرِ ساحل ہے آج

رہروِ شوق کو منزل کا سلام آتا ہے
اہلِ دل مژدہ کہ اک تازہ مقام آتا ہے

ہم کہ طوفاں میں سفینوں کو ہیں کھینے والے
صدقۂ عیش قضا سے نہیں لینے والے

خارزاروں میں چلے پاؤں کے چھالے ہیں گواہ
سو بلاؤں میں گھرے گھرنے والے ہیں گواہ

پھر بھی ہاتھوں سے نہ اُمیّد کا داماں چھوڑا
کر کے ہر مرحلۂ سخت کو آساں چھوڑا

گو حریفوں کے سبب انداز وہی ہیں اب بھی
زندگی کے ستم و ناز وہی ہیں اب بھی

دل اک آہنگِ طرب خیز سے معذور نہیں
روک دو محملِ لیلیٰ کہ بہت دُور نہیں

آؤ کچھ شمعیں نئی دل میں فروزاں کرلیں
اک نیا اِس سحر تازہ سے پیماں کرلیں
شور فریاد درا بانگِ طرب زا ہوجائے
نغمۂ عیش ہر اک ساز سے برپا ہوجائے

خوش خرامی پہ آگئے لمحات
نبضِ ہستی ہے لحنِ دل کی شریک
نغمہ و شعر یک زباں ہو کر
پیش کرتے ہیں ہدیۂ تبریک

نغمہ

صبحِ آزادی کی جاں پرور کرن
چھڑ رہے ساز آرزو پہ زخمہ زن
پھر لگی ہر دل میں اک تازہ لگن
لہلہایا حسرتوں کا پھول بن

یہ بہاریں یہ شگوفے یہ چمن
ہاں مبارک ہوں رفیقانِ وطن!

[illegible] اسلامیہ دہلی

چشمۂ خورشیدِ خاور پر قیام
ہاں مبارک اخترانِ تیز گام
امن و آزادی کا یہ خوشتر نظام
ہاں مبارک ملّتِ عالی مقام

سایۂ امن و اماں تجھ پر مدام
سازگار آئے صداقت کا چلن

پھر اُجالا ہو گیا اترا گہن
کفر ٹوٹا طے ہوئی منزل کٹھن
پھر جبینِ سنگ سے پھوٹی کرن
پھر بہاراں بن گئی خاکِ وطن

پھر چمن سے مٹ گیا داغِ دمن
ہاں مبارک نو بہارانِ چمن

جب کہ پھیلی ہوئی ہر سمت مسرّت کی ہے ضو
دلِ شاعر نے لگا رکھی ہے تقدیر سے لو

تازہ تحریر فسانوں کو الٹتا ہے کبھی
آپ ہی ایک ورق اور پلٹتا ہے کبھی
ابھی گزری ہوئی کانوں میں صدا آتی ہے
کبھی فردا کوئی تصویر دکھا جاتی ہے
کبھی حسرت کبھی فرحت کبھی غم ہوتا ہے
دیدۂ ہر دم کبھی روشن کبھی نم ہوتا ہے
سیکڑوں عبرت و حیرت کے فسانے اٹھے
کتنے اقلیم تمدن کے خزانے اٹھے
قافلہ اک کبھی مکے سے مدینے آیا
کبھی تاریخ نے پھر کوئی سبق دہرایا
چشم حیراں کبھی دلی کبھی بغداد گئی
ایک یاد آئی کبھی چھیڑ کے اک یاد گئی
کچھ ان اوراق میں نقشے ہی عجیب آتے ہیں
چین و غرناطہ و ملتان قریب آتے ہیں
کبھی حمرا کے فسانوں میں مزا ملتا ہے
اوج و اقبال کی راہوں کا پتا ملتا ہے

فرد ہے لیکن بجائے خیل ہے — قطرہ کیفیت نمائے سیل ہے
خامشی میں اس کی دھیمی سی فغاں — تھی وجودِ سوزِ غیرت کا نشاں
جیسے کندن کی کسوٹی پر لکیر — جیسے تنہائی میں آوازِ ضمیر
چہرہ بارِ غم سے حسرتناک تھا — اک شرارِ مغلوبِ صد خاشاک تھا

شدتِ احساس کا مارا ہوا
فرطِ غم سے یوں نزار آرا ہوا

غزل

غنچۂ دل لبِ اظہار کو شاد نہ ہونے پائے
خوش نصیب تھے کبھی جو آزاد نہ ہونے پائے

بندِ غم ایک دوراں بھی گلوگیر رہا
دام سے چھٹ کے بھی آزاد نہ ہونے پائے

ڈھائے خود مری وحشت ہی نے تعمیرِ ستم
اس ستمگر سے جو ایجاد نہ ہونے پائے

ڈھونڈ ان خانہ خرابوں کو بھی اے بادِ بہار
زیرِ مرقد بھی جو آباد نہ ہونے پائے

عمر بھر پنجرۂ صیاد میں رہ کر بھی اسیر
واقفِ سیرتِ صیاد نہ ہونے پائے

نذر ہے عبرت کو کہ ہر درس اسی شے کے رہوں
بے خودی اتنی ہے کچھ یاد نہ ہونے پائے

بلبلیں لے وہ نیا گل نے کہ بڑھ کر اس سے
دستِ گلچیں سے بھی برباد نہ ہونے پائے

تنگ ہے سینۂ ہستی پہ وہ بدسے شیر لب
سیرِ تماشا سے لبِ فریاد نہ ہونے پائے

مدعا کون سے کیا لے یہ روش آرائے چمن
یعنی گلشن ترا آباد نہ ہونے پائے

آئی سر پر وہ قیامت ہے کہ اے میرے خدا
ایسی دشمن پہ بھی افتاد نہ ہونے پائے

ہاں کھلا تازہ شگوفہ کوئی لے یادِ بہار
رائیگاں دل کی یہ فریاد نہ ہونے پائے

یہ سماں تھا کہ کسی سمت سے آواز آئی	فکر کو بخشی صد رفعتِ پرواز آئی

آئی اک نغمۂ جاں بخش و دلافزا بنکر — آئی اک پیکرِ خوش طلعت و رعنا بنکر
کان کہتے تھے کہ اک لحنِ فسوں خیز ہے یہ — آنکھ سمجھی کہ کوئی خواب دلآویز ہے یہ
دل نے بچھڑے ہوئے دمساز کو پہچان لیا
آخر اُمید کی آواز کو پہچان لیا

کون سنتا ہے رنگیں ترانہ مرا
یہ زمانہ مرا ہے، زمانہ مرا!
کوئی پہچانتا ہے مجھے کیا ہوں میں
شامِ غم کا سہانا سویرا ہوں میں
میں نہ دکھلاؤں گر خواب تقدیر کے
کیوں جہاں اپنی گردش پہ قائم رہے
رقصِ انجم نہ ہو لحنِ دریا نہ ہو
یہ پھر یہ شبیں یہ سویرا نہ ہو
نوجوانوں میں ہمت مرے دم سے ہے
تن میں جاں دل میں فرحت مرے دم سے ہے

میں خیالوں میں، نظر، دِل میں، سینوں میں بھی ہوں
دانش و عقل کے ہم نشینوں میں ہوں

مجھ کو بھاتی نہیں صحبتِ ناشناس
میں بھٹکتی نہیں جا کے بُزدل کے پاس

فیض کا میرے منکر جو انساں نہ ہو
بحر کے منجدھار میں بھی ہراساں نہ ہو

ذات لیکن نہیں ہے اکیلی مری
رحمتِ حق ہے سنگی سہیلی مری

میں اُسی کی ہوں جو مجھ کو پہچان لے
سوجھ رکھتا ہو جو، بُوجھ لے جان لے

میں نہ آئی بلا ہوں کہ ٹل جاؤں گی
میں زمانے کا نقشہ بدل جاؤں گی

اے کہ جو اپنے علِّ مطالب ہے تو
میرے پاس آ جو حکمت کا طالب ہے تو

خوب روشن ہے مجھ پر حقیقت تری
تجھ کو میری ہے مجھ کو ضرورت تری

کارِ حق ہے زمانے میں کرنا تجھے
ہے بہت مرحلوں سے گزرنا تجھے
اس چمن میں نہ جب تک بہار آسکے
قابِ گیتی کو کیونکر قرار آسکے
کتنے جوہر ہیں غربت میں ویراں ابھی
کتنے ٹکڑے ہیں دل کے پریشاں ابھی
درد کتنے ہیں محتاجِ درماں ابھی
دور کتنا ہے انساں سے انساں ابھی
کتنے لب قطرۂ علم سے دور ہیں
کتنے دیدے ہیں یارب کہ بے نور ہیں
تجھ کو اس کور دنیا میں رہنا نہیں
کر دکھانا ہے کچھ صرف کہنا نہیں
میں تماشے دکھانے کی خوگر نہیں
میں فراری خیالوں کا شہپر نہیں
مجھ کو معلوم ہے سب فسانہ ترا
حق کو منظور تھا آزمانا ترا

رہنما مشعلِ راہ تھی جس کے پاس
اٹھ گیا دہر کے اک تازہ منزل کی آس

تو جو اس آزمائش پہ دل گیر ہے
سب یہ باطل کے افسوں کی تاثیر ہے

زندگی میں جو مرنے سے ڈرتے نہیں
وہ قضا کے بھی مارے سے مرتے نہیں

قوم بے سری ہے غم لاکھ جھیلی ہوئی
ہے بلاؤں سے دنیا کی کھیلی ہوئی

بس ترے صبر ہی کا تو انعام ہوں
میں اُسی رہنما کا تو پیغام ہوں

تیرے دل میں اگر دردِ ملت رہے
تو اگر پاسدارِ صداقت رہے

مفلسوں زیردستوں کا غم خوار ہو
تجھ کو بندوں سے اللہ کے پیار ہو

کوئی مشکل نہ دُنیا میں حائل رہے
کوئی دشمن نہ ہرگز مقابل رہے

گر جمعیت کا دامن ہرا کر دیا
سب حریفوں کو گویا فنا کر دیا
ہاتھ میں اپنے لے بے نواؤں کا دل
تاکہ تقویم ملت رہے مستقل

آنکھ آکر ورقِ حال پہ وا ہوتی ہے
رونق اب اور ہی کچھ نام خدا ہوتی ہے
چشم بدبیں کی لگی تھی جو نظر دُور ہوئی
طلعتِ ماہ سے سب گردِ سفر دُور ہوئی
ہے ہر اک غم سے دلِ زندہ رہا آج کے دن
ڈھونڈلی دل نے غمِ دل کی دوا آج کے دن
اک نیا رنگ بدلتا ہے زمانہ امروز
ختم ہو جاتا ہے ماضی کا فسانہ امروز
اوج و ادبار کے سب باب پرانے گذرے
وہ کرشمے وہ فسانے وہ زمانے گذرے

ہاں مگر رامشِ ہستی کا فسوں باقی ہے
دورِ گل، دورِ قمر، دورۂ خوں باقی ہے

کارواں نیک گھڑی لے کے پھر اللہ کا نام
اک نئی راہ پہ ہونے کو ہے سرگرمِ خرام

لوحِ منزل پہ لکھا ہے کہ قدم تیز رہے
خود یہ شاعر کی صدا ہے کہ قدم تیز رہے

کوچ کا ترانہ

ہاں تیز کہ چلتا ہے مقدر کا قلم تیز
ہاں تیز کہ ہے دیر سے دنیا کا قدم تیز
ہاں تیز کہ سانسوں سے ہے لمحات کا رم تیز
ہاں تیز کہ ہے سینۂ آفاق کا دم تیز

اے رہروِ نویافتہ مہمیز قدم تیز
اے مایۂ صد حسرتِ نوخیز قدم تیز!

ہاں تیز کہ ہے تجھ پہ زمانے کی نظر تیز
ہاں تیز کہ ہوتا ہے سدا رقصِ شرر تیز

ہاں تیز کہ ہے دل میں اُمیدوں کا گزر تیز
ہاں تیز کہ ہے عمرِ بہاریں کا سفر تیز

اے رہروِ نو یافتہ مہمیز قدم تیز
اے مایۂ صد حسرتِ نوخیز قدم تیز

کچھ اور ابھی گرمیٔ افکار کی ضو تیز
کچھ اور ابھی شمعِ رہِ شوق کی لَو تیز
کچھ اور ابھی پائے عمل کی تگ و دو تیز
کچھ اور ابھی ولولۂ عالمِ نَو تیز

اے رہروِ نو یافتہ مہمیز قدم تیز
اے مایۂ صد حسرتِ نوخیز قدم تیز

★ ۱۹۴۹ء

نغمۂ نوروز

صبحِ نو عشرتِ فردا کی خبر دیتی ہے
دامنِ دل گلِ اُمید سے بھر دیتی ہے
دیکھنا ہے ابھی رنگِ رُخِ عالم کہ یہ صبح
صبحِ کاذب ہے جو پیغامِ سحر دیتی ہے

زندگی وجد کناں ہے کہ نیا سال ہے آج
غم نگاہوں سے نہاں ہو کہ نیا سال ہے آج
یہ ستم بُردہ و افسردہ و غم خوردہ حیات
پھر نئے سر سے جواں ہو کہ نیا سال ہے آج

بابِ غم بند ہوا بابِ طرب باز ہوا
سالِ نو دیکھیے کس دھوم سے آغاز ہوا

نغمہ : (۱)

عیش کا دو پیغام	کہ آیا عشرت کا ہنگام
شاد ہوں خاص و عام	کہ آیا عشرت کا ہنگام
رقص ہو ہر ہر گام	کہ آیا عشرت کا ہنگام
کہ پہنچا راحت کا پیغام
کہ پایا زحمت کا انعام
کہ دل سے دور ہوئے آلام
نور سے چھلکے جام کہ آیا عشرت کا ہنگام
ہو عیش کی پھر تمہید	کہ آئی گھر گھر جگ میں عید
کہ ہوگی جگ جگ اِکی دید
کہ پائی اک تازہ امید
کہ ہوگی عہدوں کی تجدید
ہو عشرت کی تاکید	کہ آئی گھر گھر جگ میں عید
دھوم سے کھیلو حال	کہ آیا اور اک روشن سال
کہ جھومی خود تاروں کی چال
کہ چمکا ملت کا اقبال

کہ ہوگا ہر دشمن پامال

دو ہر غم کو ٹال　　کہ آیا اور اک روشن سال

دیکھیں اب رنگ ذرا اُن کی بھی بیداری کا
سالِ نو جن کو بہانہ ہوا مے خواری کا

نغمہ۔ (۲)

صبحِ نو ہے، شامِ بے صہبا گئی　　عمرِ رفتہ پھر پلٹ کر آ گئی
صبحِ نو ہے، صبحِ مے، صبحِ نشاط　　شامِ بے مے، شامِ بے مینا گئی
صبحِ نو ہے، صبحِ جنت، صبحِ من　　شامِ عسرت، شامِ غم افزا گئی
پھر لبِ مینا سے نکلا حرفِ قم　　پھر مرے ہونٹوں پہ جنبش آ گئی
پھر چلا فردوس کی جانب خیال　　پھر نظر سوئے قدِ رعنا گئی
عشق نے پھر جھوم کر چھیڑی غزل　　پھر نوائے شوق لب پر آ گئی

بات عنوانِ وفا تک کیا گئی
خود بخود اُن کی نظر شرما گئی
اِس طرح کچھ مسکرائے تیرے لب
حسرتوں کے رُخ پہ رنگت آ گئی

آج دل کو وہ نگاہِ مے فروش
پوچھ مت ہمدم کہاں پہنچا گئی

مدّتوں برہم رہی تھی جو نظر
آج مل کر جھک گئی شرما گئی

کیا کرے ایسی طبیعت کا کوئی
جب تم آئے لک چلی اٹھلا گئی

آج آتا ہی نہیں قابو میں دل
جانے کیا تیری نظر سمجھا گئی

اپنی چشمِ جلوہ آرا کے نثار
سب وہ فکرِ وعدۂ فردا گئی

بیخودی اک پل نہ آئی دل کو ہائے
آنکھ لگتے ہی قیامت آ گئی

ایک اِس رنگ میں رنگیں ہے تو اُس رنگ میں ایک
ایک اِس ڈھنگ میں ہے مست تو اُس رنگ میں ایک

دیکھتے جائیے اندازِ حریفانِ حیات
ایک سے بڑھ کے ہے اس عالمِ نیرنگ میں ایک:

نغمہ : (۳)

پہنچی ہے فصلِ گل کی بو، تازہ بتازہ نو بنو
پائی ہے لذّتِ نمو، تازہ بتازہ نو بنو
جوشِ طرب ہے چار سو، تازہ بتازہ نو بنو
مطربِ خوش نوا بگو، تازہ بتازہ نو بنو
بادۂ دلکشا بجو، تازہ بتازہ نو بنو

دیکھی بہارِ حُسنِ دوست کھل گئے شوق کے چمن
جانِ شگفتہ بن گئی رُوحِ گلاب و یاسمن
پوچھ نہ مجھ سے ہم سخن کیا ہے یہ شوق کی لگن
شاہدِ دلربائے من میکند از برائے من !
نقش و نگار و رنگ و بو، تازہ بتازہ نو بنو

جاہ و حشم کا کیا خمار، زہد کی کیا گراں سری!
خاطرِ دہر پر گراں بلکہ ہے نازِ دلبری

غمکدۂ جہاں سے مانگ ایک ہی شے بھلی بُری
برزِ حیات کے کُخوری گر نہ مدام مے خوری
بادہ بخور بیادِ او تازہ بتازہ نو بنو

جلوے جہانِ ناز کے دیکھ نہ دُور دُور سے
بڑھ کے کنارِ شوق میں بس جو چلے تو کھینچ لے
عشق کا تازہ تر پیام گوشِ صنم میں پھونک دے
با صنمے چو لعبتے خوش بنشیں بساعتے
بوسہ ستاں، بکام جو تازہ بتازہ نو بنو

اک غزل گو کی رواں طبع خداداد ہوئی
لیجے ایک چیز بڑے زور کی ارشاد ہوئی:

نغمہ: (۴)

اور ہی مانگی ہے دل نے کچھ دعا اب کے برس
دیکھیے گا مہرباں ہوتا ہے کیا اب کے برس
دردِ دل کی ڈھونڈھ لیں گے ہم دوا اب کے برس
بلکہ لے آئیں گے دل ہی دوسرا اب کے برس

رنگ لائے گی مری آہِ رسا اب کے برس
دیکھیے گزرے دلآزاروں پہ کیا اب کے برس

جھوم کر چھائی ہیں کیا رحمت کی گہری بدلیاں
یعنی برسے گی برس دن یہ گھٹا اب کے برس

چرخ نے بھی چھوڑ دی اہلِ وفا سے دشمنی
عمر نے بھی باندھ لی شرطِ وفا اب کے برس

ہم اِسی انعامِ تازہ پر ہیں خوش، الطافؔ کیا
کر لیا پھر اُس نے اک وعدہ نیا اب کے برس

قہقہے بھی ہیں ترانے بھی صدائیں بھی ہیں
وسوسے بھی ہیں اُمیدیں بھی دعائیں بھی ہیں

عہد بھی قول بھی قسمیں بھی سنی جاتی ہیں
اور کسی سمت سُلگتی سی ُبکائیں بھی ہیں

نغمہ: (۵)

کٹتے ہیں دن ہمارے فرقت میں زہر پیتے
اے کاش تم بھی سنتے صدمے جو ہم پہ بیتے

برسوں گزر گئے ہیں اک آرزو پہ جیتے
اک آرزو پہ جیتے
یہ بھی برس نہ بیتے
ڈھارس اگر نہ ہوتی کیوں دل کے چاک سیتے
کیوں خونِ دل کو اپنے اُمرت بنا کے پیتے
برسوں گزر گئے ہیں اک آرزو پہ جیتے
اک آرزو پہ جیتے
یہ بھی برس نہ بیتے
ویراں رہیں گی کب تک آنکھیں یونہی ہماری
انجانی بستیوں میں پھرتی ہیں ماری ماری
دیکھی نہ پھر وہ چتون آنکھوں کو تھی جو پیاری
دیکھے نہ پھر وہ تیور جو دل کے تھے چہیتے
برسوں گزر گئے ہیں اک آرزو پہ جیتے
اک آرزو پہ جیتے
یہ بھی برس نہ بیتے

دل کو چندے ابھی حسرت ہی پہ پلنا ہوگا
اور کچھ روز اِسی آنچ میں جلنا ہوگا
چشمِ اندیشہ کہ ہے شاہدِ فرمانِ قضا
دیکھ آئی ہے کہ کانٹوں ہی پہ چلنا ہوگا

اِس دن جو دعائیں ہیں وطن ہی کے لئے ہیں
دل کی جو صدائیں ہیں وطن ہی کے لئے ہیں
اے قصرِ امن و عشرت
تزئینِ نو مبارک
اے قصرِ امن و عشرت
عمرت دراز بادا !!
ہاں اے حصارِ رحمت
تنظیمِ نو مبارک
ہاں اے حصارِ رحمت
عمرت دراز بادا !!

اے خاکِ پاک سیرت تیرے چمن سلامت
نورِ نگاہِ ملّت افزوں ہو تیری جودت
اے کوکبِ سعادت تابندہ تیری صورت
اے مسکنِ صداقت پائندہ تیری عظمت

ہاں اے جہانِ راحت
آئینِ نو مبارک!
ہاں اے جہانِ راحت
عمرت دراز بادا!!

ذرّے تری زمیں کے ہوں آسماں کی زینت
ہوں پھول اس چمن کے سارے جہاں کی زینت
افزوں ہو تیرے دم سے کون و مکاں کی زینت
ہو نامِ پاک تیرا ہر داستاں کی زینت

جانِ جہانِ فطرت
یہ دورِ نو مبارک!
جانِ جہانِ فطرت
عمرت دراز بادا!!

بیتی برسات

(ہم ریختہ ہم ریختی)

رُوح جب شورشِ ایام سے گھبراتی ہے
یادِ رفتہ دلِ آشفتہ میں در آتی ہے
ایک بستی کو بیاباں میں اُٹھا لاتی ہے
ایک بدلی سی نگاہوں میں برس جاتی ہے

نقش سینے کے اُبھر آئے ہیں بھولے بسرے
کچھ صدائیں چلی آتی ہیں "حریمِ دل" سے:

اچھی کیا گھر کے گھٹا آئی ہے دیکھا تم نے؟
میں تو کہتی ہوں برستا ہی تو کھُل کر برسے
ایسا موسم ہو تو جی گھر میں بھلا کیسے لگے
بس کڑھائی چڑھے اور باغ میں جھُولا ڈالے

لے لو وہ پھوار پڑی! ہائے غضب کے دن ہیں
اماں سچ کہتی ہوں یہ دن تو غضب کے دن ہیں

مجھ سے کیا کہتی ہو، کہنا ہے تو بھائی سے کہو
یا میں خود کہتی ہوں، تم اُن کو یہاں بلواؤ

خود بھی تیار رہو بچوں کو بھی تیار کرو
کپڑے رکھواؤ، بکس کھولو، دری جھڑوالو

اور کیا کہتی تھی ہیں، لو بوا بس بھول گئی!
ہاں سنو، اور بھی سب بہنوں کو بھجوڈولی

تم کو کپڑوں کا بھی کچھ ہوش میاں احمد ہے
دیکھنا ڈیوڑھی میں جا کے ذرا امجد ہے

اے نصیبن! لو وہ پھر اُڑ گئی کیسی بد ہے
اِس ہرانی و جتانی کی بھی کوئی حد ہے

یونہی کمبخت مرا ناک میں دم کرتی ہے
کام کے وقت نگوڑی کہیں جا مرتی ہے

بھابی بچے کو تو میں لیتی ہوں، مجھ کو دیجے
آپ جا کر ذرا پردوں کی خبر لے لیجے!

بیوی چھوٹے میاں کہتے ہیں کہ جلدی کیجے
توبہ ہے، کہہ دو کہ آتے ہیں ذرا دم لیجے

مجھ کو گھبرانے میں کچھ اُن کو مزا آتا ہے
ریل کا وقت نہیں ہے کہ رہا جاتا ہے
کہنا لڑکے سے کہ بچے کو اُٹھا کر لائے
دشمنوں کو کبھی پسلی کا خلل ہو جائے

نوج یوں کوئی بُری فال زباں پر لائے
بات کرنے کا تمہیں دیکھئے کب ڈھنگ آئے
اے بی تم۔ لو میں نصیبن کو بڑی بی سمجھی۔
خیر، کھانے کا تو سامان وہ خود کر لیں گی

پڑ گیا جھولا چلو آؤنا اے بی کوثر!
میں ابھی آئی ذرا پٹریاں ڈالو جا کر
دیر ہوتی ہے بس اب بیٹھ بھی جاؤ آ کر
جلدی جھول آئیں کہ بارش بھی کھڑی ہے سر پر
ایسی سنتیں نہیں، کیا کہتی ہوں زینت آؤ
دیر ہوتی ہے مرا کیا ہے کُرامت آؤ

جھولتی ہو تو کوئی گیت بھی آپا گاؤ!
میں بتاؤں "وہ سکھی آئے بدروا" گاؤ

اے نہیں، گیت کوئی ڈھنگ کا، ستھرا گاؤ
میں تو کہتی ہوں چچا جان کا جھولا گاؤ:

"ساں بھر یا دیس سوکھا کیا بے کل جھولا
اب نہیں چھوڑے گا برسات کا آنچل جھولا"

ہو گیا اب تو اندھیرا، چلو درگاہ چلیں
دور ہی کیا ہے، منٹ بھر میں ابھی جا پہنچیں

رات، بیشک ہے مگر اچھا ہے برقع لے لیں
ہاں کسے یاد ہے درگاہ کا رستہ، دیکھیں

دیکھئے بھائی میاں، آپ نہ بتلائیے گا!
بولے بھابی دلہن، پہلے کدھر جائیے گا؟

اچھی منہ ڈھکنے سے ہوتی ہے مجھے تو وحشت
ایسی شاباش تمہیں، منہ تو چھپاؤ زینت

مردوئے سامنے آتے ہیں بُوا، صد رحمت
اب تو درگاہ بھی آ پہنچی، الٰہی خلقت!

دیکھنا بچیو جالی سے نہ آگے بڑھنا
فاتحہ بس یہیں درگاہ کے باہر پڑھنا

اچھا واپس چلیں جلدی کرو برسات بھی ہے
اور ان کھنڈروں میں سنتے ہیں کہ جنات بھی ہے

توبہ آپا رہی جاتی ہو، کوئی بات بھی ہے
اے بہن کیا کروں میں تھک گئی اور رات بھی ہے

واہ وا، تھک بھی گئیں خوب خدا رحم کرے
اس طرح نوج بواجوں کی کوئی چال چلے

آداب کھانا ہوا جاتا ہے ٹھنڈا امّی
ختم ہونگی بھی کبھی باتیں یہ تم بچّوں کی!

بڑی بی بیسنی روٹی تو کچھ اچھی نہ پکی
دیکھتی ہو بوا کیا شکل بنی بھرتے کی

چٹپٹے پکّے ہیں البتہ بگھارے بینگن
یہ مرے ہاتھ کا ہے دیکھئے سادا سالن

اگلے وقتوں کی سی باتیں ہی نہیں اب بیٹی
تم وہ رونق نہیں دیکھو گی جو ہم نے دیکھی

کیا لگی رہتی تھی برسات کے آنے کی خوشی
ہائے کیا ہوتی تھی اِس فصل میں گہما گہمی

یہیں برسات بلا لیتی تھی ہر بستی کو
ہم نے سُونا نہیں دیکھا کبھی اِس بستی کو

کیوں پہیلی مری بوجھیں گی بتائیں بھابی؟
اک کہانی تو سُنا دیجے ممانی بیوی

بیٹی اب سو بھی رہو رات زیادہ آئی
جائیں گے صبح خدا چاہے تو واپس دِلّی

تم جیو اور رہیں جُگ جُگ یہ بہاریں قائم
خیریت ہے تو کوئی دن میں پھر آئے جم جم!

ایسے موسم کئی آ آ کے سُہانے گزرے
وہ سماں اور وہ رُت اُن کو پکارا ہی کئے

پوچھتے ہیں وہ کھنڈر سوچ میں ہیں وہ رستے
کیا ہوئے اُجڑے دیاروں کو بسانے والے!

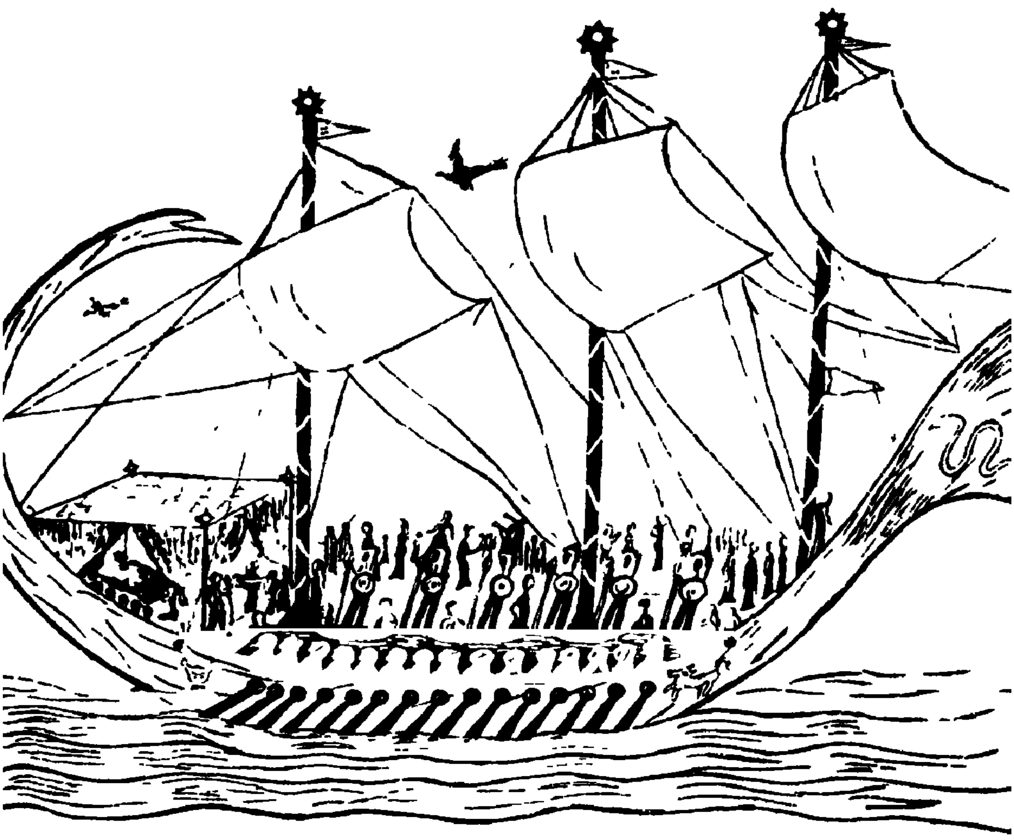
گو نہ اب کان میں آئیں وہ صدائیں شاید
اُن کو بھولی تو نہ ہوں گی وہ ہوائیں شاید

بازیافت

منتخب منظوم تراجم

[illegible]

[illegible]



(بنگالی)

موہنا کا عالم فرقت

از: دولت قاضی

(ستی موہنا و لور، چندر رانی)

جو حالت ہے مرے دل کی نہ پوچھو آلنی مجھ سے
یہ جدیا روگ جی کا ہو گیا ہے لور کے پیچھے
مجھے کیا گر گھٹا چھائی، مرے آنگن میں کیوں برسے
نظر میں کیا جچیں یہ رنگ جب جی پیار کو ترسے
گھٹا چھائی ہے چاروں سمت میری بیکسی بنکر
مرے دل میں گھسی جاتی ہے بجلی تیر سی بنکر

سکھی رہنے دے مت کر ایسی باتیں جن سے وحشت ہو
کہاں ہوگا وہ بر جس کو مرے دلبر سے نسبت ہو

پرائے کیا، مرا دل اب ہے اپنوں سے بھی بیگانہ
کہاں یہ بوالہوس بھونرے، کہاں وہ میرا پروانہ

خدا رکھے اُسے، باز آئی میں اوروں کی الفت سے
خدا شاہد ہے نفرت ہے مجھے مردوں کی صورت سے

کوئی طالب ہو کیوں میرا سمجھتی ہوں سب فن ہے
مری نظروں میں ہر دستِ سوالی سانپ کا پھن ہے

محبت کا وہ پودا جس کو ہم دونوں نے سینچا ہے
وہ ہر فرقِ مراتب نام اور نسبت سے بالا ہے

بتاؤ کیا وہ اس رُت ہی کی خاطر لوٹ آئیگا؟
نہیں تو رنجِ فرقت مجھ سے اب جھیلا نہ جائیگا

(بیگم محمد حسین کے انگریزی ترجمہ پر مبنی)

بنگالی

عمرؓ

[illegible]

[illegible]

شبِ تاریک میں
اک دُور کی مسجد سے آتی ہے
صدا اللہ اکبر کی!
مجھے لگتی ہے آوازِ موذن دل گداز ایسی
کہ جیسے کوئی واماندہ
لُٹا کر اپنا سب کچھ دے دہائی اپنے مالک کی۔

ہے تیرا نام بھی سالارِ امت! ان صداؤں میں
موذن اِس کو کیا جانے
مگر اُس کی صدا میں گونج ہے اِس نام نامی کی

اچانک کان میں آئی صدا اللہ اکبر کی
میں تعظیماً کھڑا ہوں، جھانکتا ہوں اپنی کھڑکی سے
اُجالا ہو گیا ہر سو
کہ جیسے چاند ظلمت سے نکل آیا
نہیں شاید یہ ہے چہکار بلبل کی
چکورے کی صدا ہوگی۔
میں حیران و سراسیمہ پلٹ آتا ہوں بستر پہ
سرہانے بول اٹھا گھنٹہ "گئے وہ دن، گئے وہ دن"
یہی ہے وہ صدا شاید،
یہی ہے وہ نوائے جانفزا شاید،
جو بازوئے محمد، فخرِ امت
دوستدارِ دیں عمر فاروق کے ہونٹوں سے نکلی تھی۔

سنائی اے پناہ دیں فقط اپنی صدا تو نے
ضرورت تو مری دنیا کو تیرے دم قدم کی تھی
چھپا ہے آفتاب اسلام کا ظلمت کے پردے میں

سمٹتی جا رہی ہیں دن بہ دن تابانیاں اس کی
صداقت کا اُجالا ہو گیا کافور نظروں سے
جھلک سی جیسے جگنو کی ہے باقی، ورنہ تاریکی

جہاں کو یاد ہیں اب تک وہ دن اے دین کے رہبر!
یہ دنیا گھومتی تھی تیری انگلی کے اشاروں پر
وہ دن بھی، رکھ دیا تھا تو نے جب شمشیر کو آ کر
نبیٔ حق محمد سرورِ عالم کے قدموں پر
اتر آ آسمانی مستقر سے اپنے، دنیا میں
یہی وہ وقت ہے بیشک
ہمیں لے چل پھر اپنی تیغِ باطل سوز کے پیچھے
کنارِ بحرِ احمر تک،
کہ ہم خوں میں نہا کر مرتبہ پائیں شہادت کا
فدا ہو جائیں حق پر بول ہو بالا صداقت کا

ہمیں کر دے عطا پھر جامۂ گلگوں شہیدوں کا

ہمارے سر کو عزت بخش ریگ سرخ صحرا سے
بتا ہم کو کہاں کس گوشۂ صحرا میں بیٹھی ہے
عروسِ محمل آرائے شہادت خیر مقدم کو

عجب وقتِ عشا گونجی اذاں مینار مسجد سے
ابھر آئیں مرے سینے میں کتنی دلکشا یادیں
نظر میں پھر گئے میری ہزاروں جانفزا نقشے
بہت سے ذہن کے تاریک گوشے جگمگا اٹھے

تصور کا براق اُس جا مجھے دوڑا کے لے آیا
جہاں ابھرا تھا تو یکبار تیرہ سو برس پہلے
مثالِ آفتابِ عالم آرا خاکِ صحرا سے
عرب کی سرزمیں اک عالمِ انوار تھی گویا

عرب کی سرزمیں پر تھا رواں اک سیلِ نورانی
حرا کے غار سے پھوٹے تھے اِن انوار کے سوتے

عرب کیا ساری دنیا کو کیا سیرابِ نور اس نے
یہ دنیا زاہدہ بن کر نہا کر ہو کے پاک آخر
تلاوت کر رہی تھی باادب آیات قرآنی

کسے معلوم تھا پھوٹیں گے صحرا میں بھی فوارے
خدا کی شان نکلے پتھروں میں نور کے دھارے
جہاں پر ابر رحمت کے سراسر کھل پڑے گویا
رواں ساتوں سمندر سات سو دھاروں میں تھے گویا
زمیں پر آئے محبوبِ خدا شمعِ ھدیٰ بن کر
جہانِ کفر کانپ اٹھا ظہورِ حق کی ہیبت سے
تری ہمت کہ روکا حق کو بھی سینہ سپر ہو کر
ترا بے خوف دل معمور تھا جوشِ بغاوت سے
اٹھا کر اپنی تیغِ خونفشاں یوں تو نے للکارا
کہ ہو گی سرخرو شمشیر میری خونِ مُسلم سے

"چھپے ہیں کس طرف دیکھوں یہ آن دیکھے خدا والے"

اسی جوشِ غضب میں تو نے اُس جانب قدم مارا
"مگر کانوں میں یہ کیسی صدائے سحر کار آئی
یہ کیا پیغام سنتا ہوں؟ یہ ہے اسرار کیا آخر؟
یہ تھی ہمشیر تیری، فاطمہ، محوِ خوشں الحانی
اتر کر ہی رہیں دل میں ترے آیاتِ قرآنی
رواں آنکھوں سے تیری آنسوؤں کا تار تھا آخر

ترے دربار میں آتے تھے اپنے اور بیگانے
ہزاروں میل سے چل کر،
"خلیفہ کون سے ہیں کس جگہ ہیں کوئی بتلاؤ؟"
سخن ہوتا ہر اک لب پر،
نظر اٹھی تو دیکھا صحن میں جامہ رفو کرتے
وہ تیرا ایک ہی کرتا وہ تیری ایک ہی چادر!

خلیفہ اہلِ ایماں کے!
اے کملی پوش سلطانوں کے سلطاں، صاحبِ دوراں

قصیدہ کیا لکھوں تیرا
ستائش سے ہے تو بالا
کہ تو انسان کو انساں سمجھتا، دوست رکھتا تھا
تری نظروں میں مستحکم تھا رشتہ بھائی بھائی کا
ستائش کی یہی صورت ہمارے دل کو آتی ہے
کہ تیری یاد آتی ہے تو آنکھ آنسو بہاتی ہے۔
تو میرا دوست ہی دلدار ہی، دل میں ہی جا تیری
محبت کے سوا مجھ سے ثنا خوانی ہو کیا تیری
مرے دل میں ہو جا تیری، کلام آگے نہیں بڑھتا
جگر سے ہاتھ بھی وقتِ سلام آگے نہیں بڑھتا!

شہادت تو نے پائی تھی اسی ماہِ محرّم میں
کہ جس میں ڈوبتے ہیں جان و دل حسنین کے غم میں!
دعا کر تو کہ میں بھی ہوں شہید انساں کے ہاتھوں سے
مجھے بھی موت کے بدلے خُدا یہ زندگی بخشے!

شاعر

(از: قاضی نذرالاسلام)

اسی باعث میں شاعر ہوں کہ تجھ کو پیار ہے مجھ سے
مری حسن آفرینی عکس ہے تیری محبّت کا
اسی باعث ہوں قدرت کے مظاہر کو بھی میں پیار
یہ بادِ صبح یہ نورِ سحر یہ شام کا تار
یہ مشرق سے ابلتا چشمۂ خورشید کا دھا
نوازش مجھ پہ اِن کی، فیض ہے تیری ہی الفت کا
مری ہستی نہاں تھی تیرے دامن کی پناہوں م
ملی آخر نئی منزل مجھے تیری نگاہوں میر
ترے ہی دم قدم کی روشنی ہے میری راہوں می
میں تھا شمشیر اب ہوں سازِ شیریں دستِ قدرت کا
کرشمہ ہے مری نغمہ سرائی تیری الفت کا
مری حسن آفرینی عکس ہے تیری محبت کا

بنگالی

گیت

(از: قاضی نذر الاسلام)

تو کون ہے جس کے تبسم سے　　سویا ہوا پتھر جاگ اٹھا
سنگیت کی برف پگھل نکلی　　نغمات کا چشمہ پھوٹ بہا

بن تیری گود کے چین کہاں　　سدھ ماتے مورکھ من کے لئے
ہیں آنسو کتنی ہی آنکھوں میں　　بیتاب ترے دامن کے لئے!

کھلتی ہیں ترے ہی قدموں سے　　یہ کلیاں میرے گیتوں کی
اک روز سلا بھی لے گی نہیں　　تیری ہی لٹوں کی اندھیاری

ہے تیری نظر کی جیوتی سے　　جگمگ جگمگ آکاش مرا
تو کون ہے جس کے اشارے سے　　سویا ہوا پتھر جاگ اٹھا!

(ان تراجم میں بیگم محمد حسین و میزان الرحمن صاحب کے انگریزی تراجم نیز شخصی اعانت سے استفادہ کیا گیا ہے)

انگریزی

خوفِ مرگ

(از: جان کیٹس)

یاد آتا ہے مجھے جب اپنا وقتِ واپسیں
سہمتا ہوں جب خیالِ مرگِ بے ہنگام سے
سوچتا ہوں ناشگفتہ ہی نہ رہ جائیں کہیں
یہ شگوفے آہ میرے گلشنِ تخئیل کے

پھونک دے برقِ فنا شاید مری کشتِ حسیں
پیشتر اس سے کہ میرا خامہ گل چینی کرے

دیکھتا ہوں جب گھنے تاروں کی سیلیں چھاؤں میں
دور، پُرحیرت رفیع الشان رومانوں کے خواب
سوچتا ہوں دیکھئے کب ان کی تعبیریں ملیں
کھول سکتا کاش ان موہوم افسانوں کے باب

آہ لیکن مختصر ہے زندگی کی ساعتیں
حسرتِ حاصل پہ دل کھاتا ہی کیا کیا پیچ و تاب

جب یہ سوچتا ہوں اے مری لیلیٰ جاں
ڈالے گا اک دن ہی مجھ پر بھی نگاہِ آخریں
کچھ نہیں ہوگا تخیل یوں تری جانب رواں
پھر نہ لیں، تھکن تری آنکھوں سے ملنے پائیں گی

آہ پھر الفت کا یہ آغوشِ فردوسی کہاں
خاک میں مل جائیگا اک دن یہ گریہ عشق بھی

تب میں ساحل پہ محیطِ دہر کے تنہا کھڑا
دور ہو کر اس رواں سے غور کرتا ہوں ذرا
رفتہ رفتہ محو ہو جاتا ہے ہر سودائے خام
ہیچ رہ جاتے ہیں سب کیا عشق کیا پائے نام!

فرصت

(از: ڈیویز)

کیا یہ بھی زندگی ہے، اُلجھی ہوئی غموں میں
فرصت نہیں کہ ٹھہریں کچھ آنکھ بھر کے دیکھیں

فرصت نہیں کہ ٹھہریں دم بھر تنا تلے ہی خالی
کرتے ہیں ڈھور ڈانگر جس چین سے جگالی

فرصت نہیں کہ دیکھیں راہوں میں آتے جاتے
میوے گلہریوں نے رکھے کہاں چھپا کے

فرصت نہیں کہ ٹھٹکیں رستے میں لحظہ بھر کو
گر کوئی ماہ پیکر کھینچے کبھی نظر کو

فرصت نہیں کہ ٹھٹکیں گر آنکھ مل بھی جائے
اتنا کہ مسکراہٹ آنکھوں سے لب تک آئے

فرصت نہیں کہ دیکھیں دن کو ندی کنارے
کرنوں نے کیا جڑے ہیں آبِ رواں پہ تارے

کیا خاک زندگی ہے جکڑی مصیبتوں میں
فرصت نہیں کہ ٹھہریں کچھ آنکھ بھر کے دیکھیں

کلوپٹرا کی طنّازی

(از شیکسپیر "انطنی و کلوپٹرا" ریختۂ معصومہ تیمور کے اقتباسات)

(ایکٹ ۱، منظر ۳)

کلوپٹرا: دیکھو ہیں کس کے ساتھ، کیا کر رہے ہیں، جاؤ
چپکے سے، جیسے میں نے نہیں بھیجا۔ دیکھ آؤ نا
افسردہ ہوں تو کہنا کہ وہ محوِ رقص تھیں
خوش ہوں تو یہ بتانا کہ بیمار پڑ گئیں
چارمین (خواص): بیگم اگر انطنی سے محبت ہی ہے تمہیں
اِس طور سے تو وہ نہیں آنے کے دام میں
کلوپٹرا: پھر کیا کروں میں کیا نہیں کرتی۔ بتا مجھے؟
چارمین: خود جھکیے بات بات پہ اُلجھا نہ کیجیے
کلوپٹرا: ناداں اُلٹے طور سکھاتی ہے تو مجھے؟

چارمین: اچھا ہے اُن کو حد سے زیادہ نہ چھیڑیئے
انجام رعب وداب کا ہوتا ہے بد دلی
اتنا بھی مت جھنکائیے، وہ آئے نطنی!

(نطنی داخل ہو)

کلوپٹرا: میں آج کچھ اُداس ہوں ماندا ہے جی مرا
نطنی: افسوس لب پہ لانا ہی پڑتا ہے مدّعا
کلوپٹرا: جلدی سنبھال چارمین - لیجو میں گری!
اب جان سے سہار اِس آفت کی ہو چکی
نطنی: کیوں خیریت تو ہے، مری بیگم مجھے بتاؤ؟
کلوپٹرا: لِلّٰہ مجھ سے دور رہو تم یہاں نہ آؤ
نظریں بتا رہی ہیں بھلی ہے خبر کوئی
کیا کہتی ہیں وہ بیاہتا بیوی جناب کی؟
جائیں ضرور آپ مگر کاش وہ کبھی
دیتیں نہ رخصت آپکو اِس سمت قصد کی
وہ یہ کہیں نہ سمجھیں کہ تم میرے بس میں ہو
کیا زور تم پہ میرا تم اُس کے ہو جس کے ہو
نطنی: میں کیا بتاؤں، خوب سمجھتے ہیں دیوتا

قسموں سے بلکہ تیری لرزتے ہیں دیوتا
مجھ سے جو آپ کرتے ہیں دعویٰ نباہ کا
کل عہد فلویا سے بھی شاید یہی تو تھا
کیسے کروں یقیں کہ ہو تم باوفا، ضرور
ہے اس کھلے فریب میں آنا سمجھ سے دُور
دیوانے ہی ان اوپری قسموں کے دم میں آئیں
کیا قول ہیں کہ منہ سے نکلتے میں ٹوٹ جائیں

انطنی: میری عـــزیز ملکہ

کلوپٹرا: نہ باتیں بگھاریئے
جانا ہی ہے تو جائیے جم جم، سدھاریئے
اخلاص جب روا تھا کہ تھے طالب قیام
اُس وقت کیوں نہ لیتے تھے جانے کا آپ نام؟
قول و قرار کرتے زباں سوکھتی تھی جب
تھی کونسی قسم کہ نہ لب پر رہی تھی جب؟
تقریر لب پہ رہتی تھی عیشِ دوام کی
تھی جو نظر نشاطِ ابد کا پیام تھی

کیا مدح میرے قامت و موزو میاں کی تھی
جو چیز تھی زمیں کی نہیں آسماں کی تھی
سب وہ خیال و خواب کی باتیں ہوا ہوئیں
تیور وہ تم نے بدلے کہ آنکھیں سی کھل گئیں
بن جانے گا خبر نہ تھی نیرنگ چرخ سے
جھوٹا جہاں کا، فاتح اعظم کہیں جسے!

نطنی: دیکھو تو۔۔

کلوپطرا: خیر مجھ کو وہ کس بل نہیں ملا
تب جانتے کہ مصر میں تھا کوئی دل جلا

نطنی: بیگم سنو! ضرورتِ وقتی کا اقتضا
کرتا ہے چند روز کو تم سے ہمیں جدا
چمکی ہوئی ہے روم میں پھر تیغِ سرکشی
باغی سپاہ ساحلِ روما تک آ گئی
دو خانگی سپاہ کی ٹکر ہے آپڑی!
پھیلی ہے جس سے ملک میں حد درجہ ابتری
دن لگ رہے ہیں چند حقارت زدوں کو آج

ناحق ہوئے ہیں درپئے توقیر و تخت و تاج
آئی ہے ایک اور بھی آفت مرے لئے
ہے قلوپا کی موت قیامت مرے لئے

کلوپٹرا: گو سادگی سے کر نہ سکا ہوں مجھے بری
بچپن نہیں مرا کہ نہ سمجھوں یہ جھوٹ بھی!

انطنی: ہاں مر چکی وہ۔ لمحۂ فرصت میں تم ذرا
وہ فتنے دیکھنا کہ جو وہ کر گئی بپا

کلوپٹرا: اے وائے عشقِ خام قرابے وہ کیا ہوئے
جو اشکِ خونچکاں سے بھرے ہونگے آپ نے؟
انجام میرا قلوپا مر کر بتا گئی!
کیا کیجئے گا موت پہ میری، خبر ہوئی

انطنی: بس طے کرو یہ جھگڑے، سنو التفات سے
کچھ امر منتظر ہیں تمہاری صلاح کے
کچھ کشمکش میں آکے عجب گھر گیا ہوں میں
بے وقت آہ تم سے جُدا ہو رہا ہوں میں
لیکن رہوں جہاں بھی تمہارا رہونگا میں

تم دیکھنا کہ حکم سے باہر نہ ہونگا میں
منظور ہوگا۔ نام ہو اِس میں کہ ننگ ہو
موقوف ہے رضا پہ اماں ہو کہ جنگ ہو
سوگند اُسی کی تابشِ روئے جمیل کی
قائم ہے جس کے دم سے بہار ارضِ نیل کی!

کلوپٹرا: اے لڑکی میرا پٹکا، مگر خیر مت اتار
ہوں دم میں ماندی دم میں بھلی! جیسے اِنکا پیار

انطنی: میری حسین ملکہ! تسلّی سے کام لو
حاضر ہے میرا عشق سدا امتحان کو

کلوپٹرا: یہ فُلویا بھی کہتی تھی، بہرِ خدا ذرا
آنسو تو چار نام پہ تم اُسکے دو بہا
مجھ سے پلٹ کے لیجئے پھر رخصتِ سفر
رکھئے اِن آنسوؤں کا بھی الزام مصر پر!
ہر لحظہ ایک داؤں نیا کھیلتے رہو
جو چاہو کرلو اور کھرے کے کھرے رہو

انطنی: ملکہ! مرے لہو کو نہ کھولاؤ، بس کرو

کلوپطرا: شاباش اپنے فن کے تو تم بادشاہ ہو

نطنی: سوگند اپنی تیغ کی!

کلوپطرا: اور مشقِ ناز کی؟

کیا بات آپ کے لب افسوں طراز کی
یہ برہمی یہ بَل یہ طرحداری دیکھنا
یہ رُوما کے صف شکن کی اداکاری دیکھنا

نطنی: میرے لئے محال ہے اب ٹھہرنا یہاں

کلوپطرا: ہاں جائیے، یہ بات تو اک سنئے مہرباں
وہ یہ کہ آپ ہوتے ہیں خصت نہیں کچھ اور
ہاں یہ کہ ہم سے تم سے تھی الفت نہیں کچھ اور
کیا کہہ رہی تھی، لیجئے بس، بھول بھی گئی
اک بات تھی خیال میں آکر چلی گئی
سیکھا ہر ایک شے نے تمہارا شعار ہے
کمبخت یاد بھی مری بے اعتبار ہے!

نطنی: اِس دل لگی سے آپ کا کیا مدّعا ہوا
جانے دو اب مجھے کہ یہ لمحہ ہے کام کا

تم دیکھنا کہ حکم سے باہر نہ ہونگا میں
منظور ہو گا۔ نام ہو اِس میں کہ ننگ ہو
موقوف ہے رضا پہ اماں ہو کہ جنگ ہو
سوگند اُسی کی تابشِ روئے جمیل کی
قائم ہے جس کے دم سے بہارارضِ نیل کی!

کلوپٹرا: اے لڑکی میرا پٹکا، مگر خیر مت اتار
ہوں دم میں ماندی دم میں بھلی! جیسے انکا پیار

انطنی: میری حسین ملکہ! تسلّی سے کام لو
حاضر ہے میرا عشق سدا امتحان کو

کلوپٹرا: یہ فُلویا بھی کہتی تھی، بہرِخدا ذرا
آنسو تو چار نام پہ تم اُسکے دو بہا
مجھ سے پلٹ کے لیجئے پھر رخصتِ سفر
رکھیئے اِن آنسوؤں کا بھی الزام مصر پر!
ہر لحظہ ایک داؤں نیا کھیلتے رہو
جو چاہو کر لو اور کھرے کے کھرے رہو

انطنی: ملکہ! مرے لہو کو نہ کھولاؤ، بس کرو

کلوپطرا: شاباش اپنے فن کے تو تم بادشاہ ہو

نطنی: سوگند اپنی تیغ کی!

کلوپطرا: اور مشقِ نازکی؟

کیا بات آپ کے لبِ افسوں طراز کی

یہ برہمی یہ بَل یہ طرحداری دیکھنا

رُوما کے صف شکن کی اداکاری دیکھنا

نطنی: میرے لئے محال ہے اب ٹھہرنا یہاں

کلوپطرا: ہاں جائیے، پہ بات تو اک سنئے مہرباں

وہ یہ۔ کہ آپ ہوتے ہیں رخصت نہیں کچھ اور

ہاں یہ۔ کہ ہم سے تم سے تھی الفت نہیں کچھ اور

کیا کہہ رہی تھی، لیجئے بس، بھول بھی گئی

اک بات تھی خیال میں آکر چلی گئی

سیکھا ہر ایک شے نے تمہارا شعار ہے

کمبخت یاد بھی مری بے اعتبار ہے!

نطنی: اِس دل لگی سے آپ کا کیا مدّعا ہوا

جانے دو اب مجھے کہ یہ لمحہ ہے کام کا

کلوپٹرا: بے مدّعا سمجھتے ہیں اِس دل لگی کو آپ
پہچانتے نہیں ابھی دل کی لگی کو آپ
باتیں ہماری خیر خرافات ہی سہی
ہم نے تو اب تک آپ کی ہر بات ہی سہی
آپ اپنی جا کے خیر سے عزّت سنبھالئے
دُنیا میں خوب حوصلے دل کے نکالئے
اِن کلفتوں کو میرے لئے چھوڑ جائیے
شرطِ وفا یہی تھی کہ مُنہ موڑ جائیے
اچھا سدھارو، شاد رہو، کامراں رہو
دل سے مرے قریب رہوگے جہاں رہو
نصرت تمہاری راہوں میں گوہر فشاں رہے
لو جاؤ، دیوتاؤں کی تم پر اماں رہے!

پومپے کی بغاوت

ایکٹ: ۲، منظر: ۱

(پومپے کا باغی کیمپ - پومپے، میناس، اور منقراط فوجی لباس میں نظر آتے ہیں)

پومپے: منصف ہیں گر ہمارے قوی دست دیوتا
دیں گے انھیں کا ساتھ کہ ہے جن کا حق سوا

منقراط: ہاں اے لئیق پومپے تم نے سنا نہیں
دستور واں ہے دیر کا، اندھیر کا نہیں

پومپے: بے شک ہم اُن کے در ہی سے رکھتے ہیں آسرا
پر مدّعا بہ دیر ملا بھی تو کیا ملا

منقراط: ہم بے شعور بندے جہالت میں بے سبب
کرتے ہیں اکثر اپنی ہی آفات کی طلب
لیکن ہیں چونکہ عالم و بینا وہ کارساز
ہوجاتے ہیں ہماری دعاؤں سے بے نیاز

ہو رَدّ کوئی دعا تو خسارہ نہ جانیے
ہوتا ہے سب ہمارے بھلے ہی کے واسطے
پہلو ہے اک قبول کا ردِّ دُعا میں بھی
کچھ مصلحت ضرور ہی اس التوا میں بھی
اتنا تو ہے یقیں کہ رہوں گا میں فتح مند
تم دیکھنا رہے گا ستارہ مرا بلند
ہیں اہلِ ملک میری حمایت میں یک زباں
اور ہے حدودِ بحر پہ قائم مرا نشاں
قوت مری فروغ پہ ہے، صورتِ ہلال
اُمید کہہ رہی ہے کہ پہنچی سرِ کمال
واں انطنی ہے مصر کے خاصے اُڑا رہا
لگتا نہیں کہ کھائے گا میدان کی ہوا
قیصر کا اقتدار سہی۔ قدر جا چکی
دل ہاتھ سے نکل گئے، گو دولت آ گئی
اور لے بدس۔ وہ دونوں سے یکساں نبھاتے ہیں
یہ اُن کو کھینچتے ہیں وہ اِن کو چڑھاتے ہیں
لیکن یہ اُن کے یار نہ وہ اِن کے دوستدار

پومپے:

خاطر پہ یاں ہے میل تو دل میں وہاں غبار

میناس: قیصر وطے بدس سرِ میداں پہنچ چکے
اک لشکرِ عظیم کماں میں لئے ہوئے

پوپیے: کس سے سنا یہ؟ یہ کس نے کہا؟ سر بسر غلط!!

میناس: جی سِلوِیس سے

پوپیے: خواب ہے ہذیان ہے فقط
میں جانتا ہوں - دونوں ہیں روما ہی میں ابھی
ہیں منتظر کہ مصر سے آجائے انطنی
ہاں جانِ مصر، دامِ ہوس اور پختہ تر
افسردہ لب کو اور کچھ اپنے شگفتہ کر!
ہاں ساتھ زورِ حُسن کے جادوگری بھی ہو
اور مستی و ہوس کا فسونِ قوی بھی ہو
بدمست کو لگا دے شراب و ایاغ سے
سرشار رکھ خمار نہ اُترے دماغ سے
باورچیو! ہو کھانے میں اس کے وہ چاشنی
چٹخارہ جس کا محو زباں سے نہ ہو کبھی
غیرت کو گم رکھے یہ خور و خواب اور ابھی

غفلت میں اُس کو ہوتے دو غرقاب اور ابھی!

(داریوس داخل ہوتا ہے)

کیوں داریوس؟

داریوس: پرچہ یہ لایا ہے خاکسار
روما میں انطنی کا ہے ہر آن انتظار
آئی تھی کوچ مصر سے کرنے کی جب خبر
طے جب سے اب تک اور بھی ہوتا بڑا سفر

پومپے: کچھ اور بات ہوتی تو کرتا بھی میں خیال
میناآس جانتا ہوں میں اُس سر پھرے کا حال
لگتا نہیں مجھے کہ وہ متوالا انطنی
اتنے سے معرکے کے لئے لیس ہو کبھی
مانا کہ کارِ جنگ میں وہ عافیت پسند
بے شک و شبہ دونوں حریفوں سے ہے دو چند
تاہم ہے جائے فخر کہ خود اب تو انطنی
بھرتا تھا جس کا لہو و لعب سے نہ جی کبھی
کھنچ آئے یوں ہماری صلائے نبرد پر
اُس مرد مار ملکہ کی آغوش چھوڑ کر

میناس: لیکن مجھے تو شک ہے کہ قیصر اور انطنی
اک دوسرے کے ساتھ کھلے دل سے ہوں کبھی
بیوی نے اُس کی اپنے زمانِ حیات میں
قیصر سے بے شمار بڑھائی تھیں رنجشیں
پھر انطنی کے بھائی نے بھی اُس سے جنگ کی
گو شاید انطنی کی کوئی اِس میں شہ نہ تھی

پومپے: میناس کیا خبر ہے یہ آپس کے وسوسے
ہو جائیں محو اِس بڑی شورش کے سامنے
ہوتے نہ اِس گھڑی اگر اُن کے حریف ہم
ساماں ہو چکا تھا کہ سر پھوڑتے بہم
دل میں اِدھر اُدھر تھے بہت دن سے بل پڑے
اب آگیا تھا وقت کہ تلوار چل پڑے
شاید ہمارے ڈر سے یہ آپس کی دشمنی
مٹ جائے دل سے۔ خیر جو معبود کی خوشی
اب وقت ہے کہ زورِ شجاعت دکھائیے
چاہیں جو اپنی خیر تو جانیں لڑائیے!

انطنی اور اُس کے ہمسر

ایکٹ ۲ منظر ۲

(انطنی کی مصر سے واپسی پر اکابرینِ مملکت کی گفتگو)

(روما۔ لے پدس کا مکان۔ اِنوبارِبس (انطنی کا مصاحب) اور لے پدس نظر آتے ہیں)

لے پدس: شاباش اِنو! تم آج گر اپنے امیر کو
مائل مصالحت ہی پہ رکھو تو خوب ہو

اِنوبارِبس[1]: میری تو اُن سے عرض یہ ہے۔ کوئی کچھ کہے
باتیں وہی کریں کہ جو شایاں ہوں شان کے
قیصر گر ایسی ویسی نکالیں زبان سے
لازم ہے وہ بھی بات کریں آسمان سے
ہوتا اگر اُن کے رتبے پہ جرأت معاف ہیں
کرتا قسم ہے، آج نہ ڈاڑھی بھی صاف میں[2]

---

[1] اِنوبارِبس ایک آزاد بیباک مگر خلوص مند اور سمجھدار کیرکٹر ہے۔ [2] قیصر کی توہین کرنے کے لئے بغیر خط بنوائے سامنے آنا غالباً اشارہ یہ بھی ہے کہ قیصر کی ڈاڑھی بہت خفیف تھی۔

لے بدس : لیکن نہیں یہ وقت کہ آپس میں شر اٹھے

اِنو بارِبس : جی بات کا تو وقت وہی ہے جب آ پڑے

لے بدس : لیکن گر اس معاملہ فائق ہے خورد پہ

انو بارِبس : جی اس سے کچھ غرض نہیں جو اٹھے بیشتر

لے بدس : جوشیلا پن ہے محض تمہارا یہ کچھ نہیں

اُکسانہ دینا اور دبی آگ کو کہیں

وہ آ رہے ہیں سامنے ذبقدر رانطنی

انو بارِبس : اور لیجے وہ پہنچ گئے قیصر بھی ساتھ ہی

(رانطنی اور قیصر مع چند ساتھیوں کے داخل ہوتے ہیں)

لے بدس : میرے رفیقو! جمع کیا ہم کو اس جگہ

جس چیز نے، وہ ہے اک اہم تر معاملہ

پس احتیاط اس امر کی لازم ہے آپ کو

ناگاہ ہیچ بات پہ رنجش بہم نہ ہو

شکوے ہوں کچھ اگر تو سنیں گوشِ لطف سے

مقصد ہے صلح و خیر تو پھر بات کیوں بڑھے؟

نازک ہے دل کا کارِ جراحت خبر رہے

مرہم سے کام لیجے نہ نشتر سے چھیڑیئے

یہ التجا ہے میری رفیقانِ محترم!
صلح و صلاحیت سے کریں گفتگو بہم
دکھتی جگہ کو چھیڑیں تو نرمی سے چھیڑیئے
ایسا نہ ہو کہ تیز ہو گفتار، شر بڑھے
اِس کا بھی پاس ہو کہ یہ ہے میری التجا

انطنی: ہاں آپ نے یہ خوب کہا اور بجا کہا
ہوتے حریف ہم سرِ میداں اگر کبھی
میں اُس گھڑی بھی بڑھ کے جو کرتا تو بس یہی

(قیصر سے مصافحہ کرتا ہے)

قیصر: خوش آمدید

انطنی: شکریہ

قیصر: آرام کیجئے

انطنی: جی آپ بھی تو بیٹھیئے

قیصر: بہتر ہے لیجئے

انطنی: سنتا ہوں آپ مجھ سے ہیں کچھ بے سبب خفا؟
یا اُن پہ جن اُمور سے کچھ واسطہ نہ تھا؟

قیصر: حیرت ہے مجھ پہ مفت کا ہو گر گلا مجھے

پھر اور بھی کسی سے نہیں ۔ وہ بھی آپ سے!
اور حیف ہے زباں سے کہوں گر کچھ آپ کو
اُس بات پر کہ جس سے مجھے واسطہ نہ ہو!

انطنی: پھر میں جنابِ مصر میں جا کر اگر رہا
فرمائیے کہ آپ کو کیا اِس سے کام تھا؟

قیصر: اِتنا ہی جتنا رُوم میں میرے قیام سے
واں مصر میں جناب کو بالفرض کچھ رہے
لیکن اگر آپ مصر میں رہ کر خطا معاف
کچھ سازشیں بھی کرتے رہیں میرے برخلاف
تو پھر بتائیے مجھے کیونکر گِلا نہ ہو؟
اور آپ کے قیام سے کیوں واسطہ نہ ہو؟

انطنی: سازش سے کیا مراد؟

قیصر: سمجھ ہی نہ لیجئے
واقف ہیں آپ پیش جو آیا یہاں مجھے
بیگم نے اور بھائی نے کی جنگ آپ کے
یہ آپ ہی کے بل پہ ہوئے اُن کو حوصلے
عنوانِ جنگ خیر سے تھا آپ ہی کا نام

اور نعرۂ نبرد رہا آپ ہی کا نام!

انطنی: ہے مہرباں یہ محض غلط فہمی آپ کی
یہ جنگ میرے نام پہ ہرگز نہیں ہوئی
بالکل غلط ہے خوب میں تحقیق کر چکا
خود ساتھیوں نے آپ کے تصدیق کر دیا
اور لُوسیس[1] نے آپ سے گر کی تھی سرکشی
تو کیا رفیقِ من یہ مجھی سے دغا نہ تھی؟
جب مشترک ہے منصب و مَیل و معاملہ
تھا آپ سے تو گویا مجھی سے تھا معرکہ
میں کر چکا ہوں صاف یہ اپنے خطوں میں بھی
لڑنا ہی ہے تو اور کسی بات پر سہی!

قیصر: کہہ کر خطائے فہم بری ہو گئے جناب
تاویل محض ہی تو تھا وہ آپ کا جواب

انطنی: بالکل نہیں کبھی نہیں معلوم ہے مجھے
روشن ہی بات خود بھی سمجھ لیں گے آپ اسے

---

[1] لُوسیس انطنی کا بھائی۔

جس جنگ سے خطر مری خود عافیت کو تھا
میں، آپ کا حلیف، اُسے کیونکر سراہتا؟
بیگم[1] کی بات یہ ہے کہ بس کیا بتائیے
ایسی ہی کوئی خود کو بھی ملتی تو جانتے
آساں ہے آپ اپنے تہائی[2] جہان کو
تابع رکھیں پہ بس میں نہ وہ جانِ یار ہو

اینوباربس: اے کاش ایسی بیوی ملے ہر شرائیت کو
اچھا ہے خوب عورتوں مردوں میں جنگ ہو

انٹونی: بے کل تھی، بے مہار تھی، پُرفن بھی، تیز بھی
جو کچھ بھی تھی، ضرور تھی پر لاعلاج تھی
ہاں آپ اُس کے ہاتھوں پریشاں بہت ہوئے
تسلیم ہے یہ مجھ کو، بہت رنج ہے مجھے
میں خوب جانتا ہوں اُٹھائے جو اُس نے شر
پر دیکھئے تھا میں بھی تو مجبور کس قدر!

قیصر: قاصد بھی میں نے آپ کو بھیجے کہ کچھ کہیں!
دیتے تھے دادِ عیش جب اسکندریہ میں

---

[1] فلویا انطونی کی سابقہ بیوی جو مر چکی۔
[2] سلطنت روما کے تین مشترک حاکم تھے اور یہ سلطنت اس وقت عالمگیر سمجھی جاتی تھی۔

پر بے پڑھے ہی جیب میں خط رکھ لیا گیا
اور منہ بنا کے آپ نے اُن کو بڑھا دیا
انطنی: لیکن وہ بے طلب کیے در آئے سامنے
تھا دوسرے سُرور بھی اُس وقت کچھ مجھے
وہ تین بادشاہوں کی دعوت کا روز تھا
میں جتنا ٹھیک صبح تھا شب کو نہیں رہا
یہ بات اگلے روز بتا دی تھی اُن کو بھی
اور اِس طرح کہ گویا وہ اک معذرت ہی تھی
لڑنا ہو گر تو لڑیئے۔ پر اس بات پر نہیں
ہو کچھ بنا تو اور ہو۔ یہ نامہ بر نہیں!
قیصر: پُورے نہ اترے آپ مگر اپنے قول میں
ہے منہ کہ آپ مجھ کو یہ الزام دے سکیں؟
لے پدس: قیصر صلاحیت سے
انطنی: نہیں کہنے دیجئے
بات آ پڑی ہے قول کی یہ تشنہ کیوں رہے
بدعہد ہوں اگر تو یہ جو کچھ کہیں بجا
ہاں قیصر آپ بولئے وہ قول کونسا؟

قیصر: اسباب و اسلحہ مجھے دیں گے یہ عہد تھا
جب وقت آیا دونوں سے انکار ہو گیا

انطنی: یہ کہیئے غفلت۔ اور وہ اُس آن میں ہوئی
جب اِس خراب حال کو اپنی بھی سُدھ نہ تھی
اِس پر ضرور آپ سے نادم رہوں گا میں
اور جس قدر بنے گا تلافی کروں گا میں
آئے گا اِس سے فرق نہ میرے وقار میں
شامل ہے صاف گوئی مرے افتخار میں
سچ یہ ہے فُل وِیا نے جو کی جنگ آپ سے
وہ یوں کہ میں کشاں کشاں آجاؤں مصر سے
پس میں جو اِس فساد کا ناحق سبب بنا
اور شرمسار مفت میں یوں آپ سے ہوا
خواہانِ معذرت ہوں اُسی انکسار سے
جو زیب اِس خصوص میں میرے شرف کو دے

لے پدس: شایانِ شاں یہی تھا۔ بہت خوب۔ مرحبا!

میکناس: خاطر نشیں ہو گر تو ہے میری بھی التجا
اِن رنجشوں کو دل سے فراموش کیجیے

یعنی نزاکتِ وقت کو خاطر میں لائیے

لے پڈس: شاباش میکناس! بجا ہے تمہاری رائے

انوباربس: صورت اک اور بھی ہے گر ان کی سمجھ میں آئے

اک دوسرے کو دل یہ سرِ دست سونپ دیں

ایسا ہی ہے تو پھیر لیں کل قصّے کریں!

جب پومپے کا نام نہ کانوں میں آئے گا

فرصت جھڑپ کی ہوگی بہت۔ دیکھا جائے گا

انطنی: لشکر کے اک جوان ہو تم حد سے مت بڑھو

انوباربس: ہاں بھولا میں کہ سچ کے دہن میں زباں نہ ہو!

انطنی: سنجیدگی کا وقت ہے حدِ ادب رہے

انوباربس: سنجیدہ ہو تو سنگ ہو۔ بہتر ہے چھوڑیئے

قیصر: گو طرزِ خوش نہ آیا مجھے بات ٹھیک تھی

ہو جائے ختم یونہی عجب کیا یہ دوستی

یہ حال اختلافِ عمل کا ہے گر ہنوز

ہوتا مجھے یہی نظر آتا ہے ایک روز

تاہم کہیں وہ شے کہ بہم متفق رکھے

ہو گر تو شرق و غرب سے پیدا کروں اُسے

اگریپا: گر ہو رضا تو عرض ہے اک میری

قیصر: ہاں کہو!

اگریپا: ناچیز ایک رائے ہے شاید قبول ہو
ناکتخدا ہیں خیر سے ہمشیرہ آپ کی
اور جانتے ہیں آپ مجرّد ہیں انطنی

قیصر: یہ کیا کہا۔ ابھی قلوبطرہ ہو یہاں اگر
خوب اس زباں درازی پہ دہ لے تری خبر!

انطنی: شادی نہیں ہوئی مری قیصر نہ روکئے
میں سننا چاہتا ہوں اسے کہنے دیجئے

اگریپا: اک رشتۂ مبارک و محکم کا ہو قیام
باہم برادرانہ محبّت رہے مدام
اور یوں ملے کہ پھر نہ کھنچے دوستی کا ہاتھ
شادی کریں گر انطنی اوکیتویا کے ساتھ
موزوں ہے اُس کے حسنِ دلآرا کے واسطے
وہ بر جہاں میں جس کا مقابل نہ مل سکے
وہ مردِ باکمال و جواں سال و خوش خصال
ناپید جس کے جوہرِ ذاتی کی ہے مثال

یہ رشتہ ہو تو دُور ہو آپس کا بغض و شر
اور سب یہ وسوسے کہ نہیں خالی از خطر
پچھلی ہر ایک تلخ حقیقت فسانہ ہو
اب سچ ہر اک فسانہ ہے راسخ ہو یا نہ ہو
آپس میں اُس کے فیضِ محبّت سے دل ملیں
یہ دل ملیں تو سارے زمانے کے دل ملیں
کی ہے یہ بات غور و تامّل کے بعد عرض
جراَت مری معاف۔ گزارش تھی میرا فرض

انطنی۔ قیصر کہیں گے کچھ؟

قیصر: نہیں جب تک نہ یہ کھلے
کیا کہتے ہیں خود انطنیؔ اس پر جو سُن چکے

انطنی: گر اگرپّیاؔ سے انطنیؔ اس وقت ہاں کہے
یاں کس کا اختیار ہے ضامن کہ نبھ سکے؟

قیصر: قیصر کا اختیار ہے ضامن اگر ہو طے،
یعنی جو اختیار اُسے اوکیتویا پہ ہے

انطنی: پھر اِس صلاحِ انسب و احسن سے کیا مجال
گر بھول کر بھی ہو مجھے انکار کا خیال

مجھ کو قبول ہے دل وجاں سے یہ مشورہ
آپ اہتمام کیجئے اس کارِ خیر کا
ملتے ہیں جس خلوص و محبت سے آج ہاتھ
ہر قصد و مہم میں رہیں دل بھی یوں ہی ساتھ

(دونوں مصافحہ کرتے ہیں)

قیصر: میں سونپتا ہوں آپ کو وہ خواہرِ عزیز
جس سے عزیز تر نہیں نظروں میں کوئی چیز
اے کاش اس کے دم سے سدا دل ملے رہیں!
اور سلطنت کے جملہ مفاصل ملے رہیں!

کلوپٹرا کا جلوس

کیا پوچھتے ہو اُس کے سفینے کی تم بہار
رکھا تھا دوشِ موج پہ اک تختِ زرنگار

کیا اُس کی آب و تاب کا عالم کہے کوئی
دریا میں ایک آگ تھی گویا لگی ہوئی

کشتی نہیں سریرِ مطلّیٰ تھا سربسر
اک شعلہ وسطِ آب بھڑکتا تھا سربسر

فردوسِ آرزو تھا عروسِ نظارہ تھا
آغوشِ رودِ نیل میں ایک مہ پارہ تھا

وہ عطر میں بسے ہوئے خوشرنگ بادباں
زنگت پہ جن کی قوسِ قزح کا ہے گماں

ان کی مہک پہ صدقے ہوئی جاتی تھی ہوا
ایک ایک بل پہ سینکڑوں بل کھاتی تھی ہوا

دنبالہ تک ڈھلے ہوئے سونے کا تھا تمام
کرتی شعاعِ مہر بھی جھک جھک کے تھی سلام

چیتۂ سڈول نقرئی زر کار و آبدار
گویا حسین آنکھوں پہ پلکوں کی تھی قطار

ہر دم غضب کی خوبی سے پڑتا تھا اُن کا ہاتھ
شہنائی کی سُریلی صداؤں کے ساتھ ساتھ

کچھ اِس ادا سے کرتے تھے دریا کے دل پہ وار
اِس ناز سے تھپکتے تھے موجوں کو بار بار

ہوتی تھی تیز پانی کی رفتار اور بھی
اور دوڑتا تھا پیچھے کہ اک بار اور بھی

لیکن بیاں محال ہے خود اُسکے حُسن کا
نطق اس کے سامنے نظر آتا ہے بے نوا

اک سر پہ شامیانہ تھا زر کار مخملی،
اور اُس میں وہ بہارِ تماشا دراز تھی

"وینس" کا وہ مرقع، تخیل کا شاہکار
صنعت سے جس کی ہوتی ہے فطرت بھی شرمسار

دیکھو تو یہ کہو وہ مرقع بھی کچھ نہیں!
کچھ اِس ادا سے جلوہ نما تھی وہ مہ جبیں

دو طفل خوبرو تھے دو جانب چنوّر لیے
ننھے ٹھوڑیوں میں جن کی غضب کے بھنور پڑے

یوں دونوں مسکراتے تھے کیوپڈ کی شان سے
اُترے ہیں جیسے آکے ابھی آسمان سے!

کیا خوب تھا چنوّر کے ہلانے کا طور بھی
دہکا رہے تھے شعلۂ عارض کو اور بھی!

کیا پوچھتے ہو اُس کی خواصوں کی آن بان
جل پریاں جیسے اس پہ فدا کر رہی تھیں جان

یوں چل رہی تھیں اُسکے اشاروں پہ ناز سے
سو سو ادا نکلتی تھی اک اک نیاز سے

پتوار پر کھڑی تھی کوئی جل پری سی نار
تھی کوئی بنتِ بحر طنابوں سے ہوشیار

وہ گورے گورے ہاتھ وہ نازک کلائیاں
انگڑائیاں سی لیتے تھے مستی میں بادباں

کشتی میں تھی عجیب و غریب ایسی کچھ مہک
پٹیں سی اُٹھ کے آتی تھیں دریا کے پاٹ تک
اُس وقت اَنطنی کا بھلا کس کو ہوش تھا
دربار اُس کا شہر میں سُونا ہی رہ گیا
خلقت تمام ٹوٹ پڑی اِس نظارے پر
سیٹی بجا رہے تھے ہوا میں جناب اُدھر
جاتی ہوا بھی سیر کو اُس دم عجب ہے کیا
دنیا میں یہ کہو کہ خلا ہی محال تھا

اُتری ہے جب کنارے تو یہ عرض کی گئی
کھانے پہ بادشاہ کو کرتے ہیں اَنطنی
بولی کہ جا کے دو مری جانب سے یہ پیام
بہتر ہے آپ ہی مرے مہماں ہوں آج شام
اب کس طرح بھلا کرے انکار اَنطنی
عورت نے اس سے نا تو سنا ہی نہیں کبھی

بجڑے گئے جناب وہیں، قصہ مختصر
دعوت میں پہنچے ملکۂ عالم کے قصر پر
اور نقدِ دل بدل میں ضیافت کے دیدیا
جس کا فقط نگاہ نے اُن کی مزا لیا

اک روز سیر کرنے جو بازار تک گئی
اٹھلا کے تھوڑی دُور عجب ناز سے چلی
دم اِس خرامِ شوخ سے کچھ پھُول سا گیا
بولی تو جیسے بات کوئی بھول سا گیا
بے حال ہونے میں بھی عجب حال اُسکا تھا
ناطاقتی میں اور سوا زور آگیا

"پر اب تو چھوڑ دیں گے اُسے شاید لطفی؟"
جی، اُن کی کیا مجال جو چھوڑیں اسے کبھی

کمھلائے اُس کو گردشِ دوراں محال ہے
برگشتہ اُس سے ہو دلِ انساں محال ہے

جادو نہ جس پہ دورِ زمانہ کا چل سکے
افسوں سے اُس کے کیا کوئی انساں نکل سکے

ہر حال میں نئی ہے وہ ہر آن میں عجیب
یہ طرفگی و تازگی ہوگی کسے نصیب

وہ عورتیں جو جی سے اُتر جائیں اور ہیں
تسکین میں بھی یاں تو طلب ہی کے طور ہیں

کیا سیر اُس کے وصل سے ہوگا کسی کا جی
ظالم بجھا بجھا کے لگاتی ہے اور بھی

بد مستیاں بھی اس کی ہیں اس درجہ دلنشیں
کرتے ہیں زاہدانِ مقدس تک آفریں!

[ایکٹ ۲، منظر ۲، سطور ۱۹۱ تا ۲۴۰]

کلوپٹرا کے آخری لمحات

(انطنی کی موت اور اپنی شکست کے بعد کلوپٹرا خودکشی کی تیاری کرتی ہے)

کلوپٹرا:

دلہن بناؤ مجھ کو سجاؤ، پہناؤ تاج!
سکھیو! میں اپنے پی کے نگر جا رہی ہوں آج
پینی تھی جتنی پی بھی چکی اِس چمن کی مے
ہونٹوں کو آج آبِ بقا کی اُمنگ ہے
اچھی اِراس! جلدی، سواری کھڑی ہے اب
کانوں میں انطنی کی صدا آ رہی ہے اب
خوش ہو رہے ہیں وہ مرے عزمِ بلند پر
ہنستے ہیں خوب قیصرِ اقبال مند (!)، پر
آتی ہوں میں ابھی، مرے "پیتم" مرے پتی
اِس "زعم" اِس "غرور" کو سچ کر دکھاؤں گی

مجھ میں اب اک شرارہ ہی باقی، جو پاک ہے
اِس کے سوا جو کچھ تھا وہ اب نذرِ خاک ہے
سب ہو چکا تو آؤ سہیلی گلے ملیں
لو زندگی کا آخری بوسہ بھی دے چلیں

[اِراس کی پیشانی کو چومتی ہے اور وہ گر کر دم دے دیتی ہے،
کیونکہ پہلے ہی زہر پی چکی تھی]

کیوں گر پڑی یہ، خیر تو ہے، کیا ہوا اِسے؟
اللہ! میرے ہونٹ بھی زہریلے ہو گئے
کیا سہل جاں نکل گئی اِس جاں نثار کی
گویا قضا نہیں، کوئی چٹکی تھی پیار کی
چپکے سے بے سلام دعا ہی گزر گئی
دنیا کے رسم و راہ پہ کیا طنز کر گئی

چارمین: کالی گھٹاؤ، آؤ، برس جاؤ، گھر کے چھاؤ!
اے دیوتاؤ، تم بھی تو آنسو ذرا بہاؤ!

کلوپٹرا: لو وہ تو مجھ سے پہلے ہی پہنچی پیا کے پاس
ہتھیا نہ لے وہ پیار، جو ہے میرے دل کی آس

(رافعی سے مخاطب ہوکر)

آ! اے حریفِ جاں، ذرا دندانِ تیز سے
یہ زندگی کا عقدۂ پیچیدہ کھول دے!
اے بے شعور، رینگتے، زہریلے جانور
ہاں پیچ و تاب کھا کے ذرا جلد وار کر
اے کاش تیرے منہ میں زباں ہو کہ تو کہے
ثابت ہوئے ہیں حضرتِ قیصر نرے گدھے

(افعی کو سینے سے لگا لیتی ہے)

چارمین: اے شرق کی جبیں کے ستارے کدھر چلا!
اے ڈوبتے نصیب ہمارے کدھر چلا!

قلوپطرا: بس چارمین صبر، یہ کیا اضطراب ہے
تو دیکھتی نہیں یہ مرا وقتِ خواب ہے
مت کہہ کہ اس جہاں سے جُدا ہو رہی ہوں میں
اک شیر خوار سینے پہ ہے۔ سو رہی ہوں میں!

[ایکٹ ۵، منظر ۲، سطور ۲۷۹ تا ۳۰۸]

غمِ جاوِداں

غزلیات ۱۹۳۸ء تک

[illegible]

[illegible]



کیجے جنونِ دل کا نہ چرچا بہت ابھی
ہے چاکِ جیب ہی کا اشارا بہت ابھی

سر میں ہے عرضِ شوق کا سودا بہت ابھی
ہونا ہے بزمِ دوست میں رسوا بہت ابھی

اے عشق میرے نالۂ برہم سے درگزر
تو خوار ہوں میں تیز ہے صبا بہت ابھی

کیوں بدگماں ہو رازِ وفا دل کو بخش کر
ہاں دل کو ہے زمانے کی پروا بہت ابھی

یہ ساعتیں بھی کم نہیں کچھ عمرِ خضر سے
ہے انتظارِ موت میں جینا بہت ابھی

حقّی طلوعِ صبحِ تمنّا ابھی کہاں!
آنکھیں تو کھولئے، ہے اندھیرا بہت ابھی

اے دل ترے خیال کی دُنیا کہاں سے لائیں
اِن وحشتوں کے واسطے صحرا کہاں سے لائیں

حسرت تو ہے یہی کہ ہو دنیا سے دل کو شوق
ہو جس سے دل کو شوق وہ دُنیا کہاں سے لائیں

دیکھا تھا جو نہالِ تمنّا کے سائے میں
اے بے دلی وہ خوابِ دلافزا کہاں سے لائیں

کیا اُس نگاہِ حوصلہ افزا کو دیں جواب
گم کر دیا جسے وہ تمنّا کہاں سے لائیں

روشن تھے جو کبھی وہ نظارے کدھر گئے
برپا تھا جو کبھی وہ تماشا کہاں سے لائیں

حقّی بہت ہے کارِ جنوں دشتِ زیست میں
آسودگانِ راہ وہ سودا کہاں سے لائیں

دیکھے بھی نہ دُنیا نے مرے دل کے شرارے
ایسے تو بہت ٹوٹتے رہتے ہیں ستارے

اے پیکرِ تمکیں ترے سُلجھے سے وہ انداز
تھے جن میں محبّت کے کچھ اُلجھے سے اشارے

مرتے ہیں بہت ہم بھی نگارانِ جہاں پر
جیتے ہیں مگر ایک تصوّر کے سہارے

اے میرے چمن تیری بہاروں کی قسم ہے
ڈھونڈیں گے نگاہوں کو یہی تیرے نظارے

گھبرا کے کبھی طُولِ شبِ غم سے جو میں نے
نظروں کو اُٹھایا ہے تو جُھک آئے ہیں تارے

جب تک نہ ہو ہر جام میں کچھ دل کا لہو بھی
ہوتے ہیں کہاں بادہ پرستوں کے گزارے

دل خستۂ بیدادِ جہاں ہے تو بجا ہے
افسردہ شجر ہی پہ چلا کرتے ہیں آرے

حقّی ہے بڑے کام کی شئے ہستیٔ ناکام
کس واسطے جلنے سے خفا ہوتے ہو پیارے!

خیال میں ہوں شبِ غم کو یوں سجائے ہوئے
کہ جیسے تم ہو مرے غمکدے میں آئے ہوئے

وہ خود ہی پھرتے ہیں منزل سے منہ چھپائے ہوئے
جو تھے مسیح و خضر کا نصیب پائے ہوئے

جفائے دہر سے کس طرح خوں ہوئے ہیں نہ پوچھ
دل و جگر ترے ہاتھوں کے آزمائے ہوئے

تری نگاہِ پُر افسوں سے کیا گلا ہو مجھے
کہ ہوں خود اپنی نظر کا فریب کھائے ہوئے

نہ پوچھ عشق کے دُنیائے ماسوا پہ ستم
یہ شہر ہیں اسی سیلِ بلا کے ڈھائے ہوئے

مرے سخن کو رہی حسرتِ نوا حقّی!
سو رشک بن گئے مضمون دل میں آئے ہوئے

سمجھ میں خاک یہ جادوگری نہیں آتی
چراغ جلتے ہیں اور روشنی نہیں آتی!
کسی کے ناز پہ افسردہ خاطری دل کی
ہنسی کی بات ہے، پھر بھی ہنسی نہیں آتی

نہ پوچھ ہئیتِ طرف وچمن کہ ابھی بھی
بہار باغ میں بہکی ہوئی نہیں آتی

ہجومِ عیش تو ان تیرہ بستیوں میں کہاں
کہیں سے آہ کی آواز بھی نہیں آتی

جدائیوں سے شکایت تو ہو ہی جاتی ہے
رفاقتوں سے وفائیں بھی نہیں آتی

کچھ ایسا خوف ہے اسبابِ عیش و رنج میں دل
کہ عیش و رنج کی پہچان ہی نہیں آتی

سزا یہ ہے کہ رہیں چشمِ لطف سے محروم
خطا یہ ہے کہ ہوس پیشگی نہیں آتی

خدا رکھے تری محفل کی رونقیں آباد!
نظارگی سے نظر میں کمی نہیں آتی

بڑی تلاش سے ملتی ہے زندگی اے دوست!
قضا کی طرح پتا پوچھتی نہیں آتی

دیکھے تو میرے شوق کا یہ پختہ پن کوئی
لگتا نہیں کہ دل میں ہے اب بھی لگن کوئی

اِس التزام سے بھی سجا ہے چمن کوئی
گُل آفریں کوئی ہے تو گُل پیرہن کوئی

نسبت خرامِ دہر سے کیا روزِ حشر کو
دیکھے تو اِس کی چال کا آہستہ پن کوئی!

زندہ اُسی کے دَم سے ہے کچھ رسمِ کافری
ہوتا ہے بُت گروں میں بھی اک بُت شکن کوئی

ہوں گے ہزار اشک زمینِ چمن میں ضم
دیکھے گا تب جبینِ گُل و یاسمن کوئی

ہوگا ہزار نالۂ بلبل فضا میں حل
تب گُل کھلا سکے گی نسیمِ چمن کوئی

سر ہے تو ہو ہی جائے گا سودا کسی کے ہاتھ
دل ہے تو لے ہی جائے گا ناوک فگن کوئی!

چھپ گئی شکل نظر سے کوئی دیکھی بھالی
آنکھ اُٹھاؤں تو نظر آتی ہے دُنیا خالی

آپ ہی آپ ہے پہلو مرا بیکل بیکل
آپ ہی دل ہے کئی روز سے خالی خالی

جی گھڑی بھر کو نہ بہلا تھا کہ آئی دل میں
یاد، کمبخت وہی دل سے نہ جانے والی

خوب سجتا ہے ترے ہاتھ میں مینا لبریز
یونہی رہنے دے مرے ہاتھ میں ساغر خالی

ایک ہی شکل ہے دل میں کہ نظر آتی ہے
کبھی کافر کبھی قاتل کبھی بھولی بھالی

حسرتیں یوں تو بہت دل میں ہیں مٹنے کیلئے
ہے مگر ایک ہی کمبخت مٹانے والی

ہے نگاہوں کے لئے جلوۂ حیرت کیا کم!
دیکھ لی ہم نے جو شے تھی نظر آنے والی

کون مانے گا کہ ہم نے یہ بلائے اُلفت
مول بازار سے لی اور گلے میں ڈالی

محبّت کے بندھن یہ کچّے سے دھاگے
بڑا دم بڑا زور رکھتے تھے آگے

بہاروں میں سینے کے خوابیدہ ارماں
خلش بن کے چونکے تڑپ بن کے جاگے

رواں ہیں سبھی ایک منزل کی جانب
کوئی ہم سے پیچھے کوئی ہم سے آگے
یہ پرسش یہ پاداشں کیوں کس خطا پہ؟
بتا تیری دنیا سے کیا لے کے بھاگے؟
بنائے تھے جو دل کی ویرانیوں میں
مری وحشتوں نے وہ مندر بھی تیاگے

بات کیسی بس اس قدر ہے کہ ہاں!
محرمانہ سی اک نظر ہے کہ ہاں!
خوب رُسوا ہے میرا ذوقِ نظر
خوش اداؤں کو سب خبر ہے کہ ہاں!
اِس طرف بھی نگاہِ خوش گزرے
عرض تم سے بس اس قدر ہے کہ ہاں!
ہوگئیں حیرتوں میں گُم آنکھیں
اور فریادِ بحر و بر ہے کہ ہاں!

اُن کا پیغامِ متّصل ہے کہ دیکھ!
دل کا ایجاب معتبر ہے کہ ہاں!

ڈال دوزخ میں نامۂ اعمال
میرا افرا مختصر ہے کہ ہاں!

ہے جہاں اِس کی گرد سے روشن
وہ خیالوں کی رہگذر ہے کہ ہاں!

ساغرِ مے بھی چشمِ تلخ سے آج
دیکھتا مجھ کو گھور کر ہے کہ ہاں!

ہم سخن تجھ کو میری جانب سے
آج پھر دعوتِ نظر ہے کہ ہاں!

منتظر اُس کی، نہ ہوگی نظر ایسی، کہ نہیں
ہاں کوئی اہلِ نظر! ہے خبر ایسی کہ نہیں؟

اُسی جلوے کے تعاقب میں ہیں نظریں میری
کہکشاں جس سے نہیں رہگزر ایسی کہ نہیں

ہم کو آسائشِ ہستی کی تمنا اے دوست
عمر ہوتی ہے یونہی کچھ بسر ایسی کہ نہیں
غیر کے دل کا ہم اک راز بتائیں تم کو
تلخ ہو گی یہ حقیقت مگر ایسی، کہ نہیں
تم پہ ہوتے ہیں سخن یوں سرِ محفل موزوں
دہن ایسا کہ یونہی سا، کمر ایسی کہ نہیں
دیجیے تذکرۂ اہلِ صفا کو کیوں طول
بزمِ رنداں میں نہ ہو گی خبر ایسی کہ نہیں
ہے وہ اک شخص کہ ہر طرزِ سخن میں جس کی
فکر ایسی ہے کہ شاید، نظر ایسی کہ نہیں!

ہوتا تری برگشتہ نگاہی پہ فدا کون
ظالم یہ ترے بھیس میں آخر ہے چھپا کون
کہتے ہو کہ اس چُپ سے الجھتا ہے مرا دم
پھر حال جو کہتے ہیں تو ہوتا ہے خفا کون

سچ ہے کہ بُتوں ہی نے کیا تھا مجھے ناشاد
سچ ہے کہ بُتوں ہی نے نہ دی دادِ خدا کون!

جیسے کہ تم آتے ہی مگر پھر بھی سحر تک
ہر لحظہ رہی آس ہر آہٹ پہ کہا کون

جو ہم کو بُرا کہتے ہیں حقّی وہی اچھے
دنیا میں تھیں سب سے بُرے ہم سے بُرا کون

کرتے رہے ہم اُن سے اِدھر کی اُدھر کی بات
لب تک نہ آئی اپنے ہی دردِ جگر کی بات

نسبت ہی اِس کو کیا مرے اشکِ رواں سے تھی
کمیابیٔ گہر نے بنائی گہر کی بات

اِس دَور میں یہ فرصتِ غم بھی کسے نصیب
فریاد ہی بہت ہے نہ کیجے اثر کی بات

دو اب لبوں کو زحمتِ گفتار یا نہ دو
ہم سب سمجھ رہے ہیں تمہاری نظر کی بات

اشکوں سے چاہے خونِ جگر دے کے سینچیے
نخلِ وفا سے دُور ہے برگ و ثمر کی بات
ہم بھی چلیں گے گردشِ دوراں ٹھہر تو جا
اک ماہ وش کا ساتھ ہے اور رات بھر کی بات

کہتی تو ہے کچھ لے دل وہ صُورتِ بیگانہ
ہوتا ہے کچھ آنکھوں سے ایمائے خفایانہ
راس آئے محبّت کو یہ طرحِ دلآرائی
اندازِ تبسّم میں اک نازِ نگارانہ
سُلجھی سی اداؤں میں نادیدہ سی اک اُلجھن
سنبھلے سے تخاطب میں لبریز سا پیمانہ
آسُودہ نہیں آنکھیں اک گل کے تماشے سے
میرا دلِ وحشی تھا ہر پھُول کا دیوانہ
دیکھی نہ گئی اُن سے اک ذرّے کی بیتابی
تکتی رہیں جو آنکھیں تاروں کو رقیبانہ

دیکھو تو سرِ گلشن ، اک سیرِ چراغاں ہے
کیا فصلِ خزاں اب کے گزری ہے بہارانہ
اے جانِ ہوس پیشہ صدقے میں فقیری کے
حاصل ہیں تجھے ارے کیا کیا غمِ شاہانہ

کیا تجھ سے کہیں ہمدم کیا آ کے عوض پایا
جو عمر نشیمن میں گزری تھی اسیرانہ!

———— ————

وائے حسرت رہ گیا خوں ہو کے دل، بے چارہ دل
اے وہ میرا شوخ دل ، دیوانہ دل آوارہ دل
مانگتا ہے پھر کسی کا عشوۂ عیّارہ دل
ذوقِ خواری لا کہیں سے ڈھونڈ کر دوبارہ دل
رہ گئی سینے میں تاراجِ گلستاں کی خلش
لے گئی پھولوں کے ساتھ اک صرصرِ آوارہ دل
صورتِ آئینہ خود اک عالمِ حیرت ہے آج
وہ مرا صاحبِ نظر دل ، عاشقِ نظّارہ دل

اب وہ آہنگِ طوافِ کوئے جانانہ کہاں!
تھا جہاں رقصاں و جولاں صورتِ سیّارہ دل

کس گھڑی باندھی تھی نظروں نے تماشے کی اُمید
آہ کیوں آیا تھا لے کر حسرتِ نظّارہ دل

دہر میں ملتی ہے حقّی کس کو منہ مانگی مُراد
خوش ہیں کچھ ہم ہی جہاں میں لیکے اک ناکارہ دل

کہاں تک آہِ بے تاثیر اے دل
نہ نکلے گا یہ غم کا تیر اے دل

کوئی تو چارۂ ارماں بھی آخر!
تڑپتے ہیں ترے نخچیر اے دل

ذرا یکجا تو کر افکارِ ویراں
چھُپی ہے اِن میں اک تصویر اے دل

کہاں تک تیرے ویرانے میں آباد
رہے گی حسرتِ تعمیر اے دل

سہارا تھا جنوں کا پائے جولاں
ابھی کیوں ہوش کی زنجیر اے دل

رُلانے آئی ہیں بسری بہاریں
ہوا کی موج ہے شمشیر اے دل

نظر آنے لگا ہے جامِ مے بھی
نگاہِ تلخ کی تصویر اے دل

نفس اک موجِ بے منزل ہے گویا
نظر اک خوابِ بے تعبیر اے دل

ہے وابستہ تری کیفیتوں سے
مرے افکار کی تقدیر اے دل

اے دل گیا وہ واہمۂ رنگ و بو کہاں
کھوئی گئی وہ انجمنِ آرزو کہاں

کچھ ہے تو میرے دم سے، مرے ہی نصیب سے
اس دہرِ سست گام کو گردش کی خو کہاں

ہرچند مسکرا کے یہ کہیئے کہ کچھ نہیں
جاتی ہے پھر بھی منہ سے مئے غم کی بو کہاں
کیا کم ہے یہ بھی داد کہ بھولے نہیں مجھے
محشر میں مجھ کو دیکھ کے کہتے ہیں تو کہاں!

حقِّ غزل کی راہ تو مشکل ہے اُن سے ہم
تم ایسے خوش کلام کہاں خوش گلو کہاں

آزارِ جسم و جاں کی طلب جیتے جی رہی
صرفِ تلاشِ درد مری زندگی رہی
کیا کیا نگاہِ شوق سماں دیکھتی رہی
اُٹھ بھی گئے گر آپ تو محفل جمی رہی
سینے کی وہ خلش سی کہ محسوس بھی نہ تھی
کیا جانِ ناتواں پہ قیامت بنی رہی
دل سے جنوں کا ایک بھی طوفاں نہ اُٹھ سکا
برسوں نگاہ دَورِ قمر دیکھتی رہی

دیکھا کہاں کسی نے مری تشنگی کا رنگ
سب کی نظر میں تیری ہی سیرابی رہی

بڑھتا گیا قدم بقدم کاروانِ شوق
بجھتے گئے چراغ مگر روشنی رہی

احساسِ درد ہی پہ رہا دم کا اعتبار
دم گھٹ گیا ہے درد میں جس دم کمی رہی

حقی مزاجِ دل نے نہ دی فرصتِ نگاہ
شہرت اک عمر نام مرا پوچھتی رہی

جانِ مے خانہ کبھی کیف سے بیگانہ کبھی
ہم نے پایا نہ مزاجِ دلِ دیوانہ کبھی

ہے مری طبعِ ہوس کوش کو کیا کیا درکار
رنجِ شاہانہ کبھی عیشِ گدایانہ کبھی

جانِ تمکیں تجھے بھولی تو نہ ہوں گی شاید
شوخیاں دل سے جو ہوتی تھیں حجابانہ کبھی

عقلِ وحشت زدہ اُس پر تو بتا کیا گزری
دل میں رہتی تھی جو اک صورتِ جانانہ کبھی

ہو بھی جاتی ہے رہِ شوق میں تنہائی قبول!
مل بھی جاتا ہے کوئی رہروِ بیگانہ کبھی

دیکھیو ٹوٹے نہ کہیں سلسلۂ فیض طلب
مے سے خالی نہ رہیں شیشہ و پیمانہ کبھی

وائے دُنیا میں وہ ناچار مسلماں حقّیؔ
جس نے دیکھی ہی نہ ہو صورتِ بتخانہ کبھی

جب ذہن میں اک ہیجان سا ہو جب سانس میں ہو اک تیزی سی
کچھ دل میں اُمنگیں اٹھتی ہیں بے نام سی بھولی بسری سی!
ہیں نقش خیالوں میں میرے کچھ جیتے جاگتے افسانے
پھرتی ہیں نگاہوں میں میری کچھ شکلیں دیکھی دیکھی سی
سرمایۂ چشمِ حیرت ہیں کچھ نقش یہی ناپیدا سے
حاصل ہیں یہی گویائی کا، کچھ باتیں بہکی بہکی سی

اک عمر انہی تحریروں کو گزری ہے سمجھتے الجھاتے
اب تک ہیں جبینِ ہستی پہ کچھ سطریں آڑی ترچھی سی
نظارۂ حسن بھی آنکھوں کو ملتا ہے بقدرِ حسنِ نظر
با شمعِ نظر افروز میں دل کرتا ہے فسوں سازی سی
آتے ہو کہاں سے ہم خیر تو ہے کیا دیکھ لیا کیا سُن پایا؟
یہ تیور بدلے بدلے سے، یہ باتیں اکھڑی اکھڑی سی
حیرت ہے کہ حتیٰ دل اب تک آسودۂ حرفِ شوق نہیں
ہر چند زبانِ دوست پہ ہے جذبات سوئے دل کی سی

کسے نصیب یہ رنجوری و شگفتہ لبی
تمہیں سے داد طلب ہے مری جفا طلبی
بنائے ہستیِ مینا وصالِ تشنہ مے
مرا ہی ذوقِ خرابی، مری ہی تشنہ لبی
ہزار درد لیے ہیں تمہارے درد کے ساتھ
ہمارا گوشۂ دل ہے جہانِ بوالعجبی

دبے گی جورِ زمانہ سے کیا مری فطرت
یہ وہ بلا ہے کہ جبرِ قضا سے بھی نہ دبی
کسی کے اک سرِ انکار نے نہ کی ہو گی
سرِ بشر نے جو کی ہے بشر سے بے ادبی

وحشتِ دل کا نگہبان بنا ہے کوئی
پھر مرا سازِ جنوں چھیڑ رہا ہے کوئی
جس کا پایا تھا بمشکل دلِ غم دیدہ نے ذوق
پھر وہ اندازِ جفا بھول گیا ہے کوئی
جس میں اک بار پڑا تھا مری وحشت کا قدم
اُسی صحرا میں مجھے ڈھونڈ رہا ہے کوئی
جس سے جل اٹھے تھے تبخانۂ حسرت کے چراغ
آج اُسی لحن میں پھر نغمہ سرا ہے کوئی
تھے کبھی مجھ سے مری سوختہ پائی کے گلے
اب مرے فکرِ گریزاں سے خفا ہے کوئی

چاکِ داماں جنوں سل تو گیا ہے لیکن
تارِ پیوندِ جگر ٹوٹ گیا ہے کوئی

پیشِ ساقی طرۂ تمکیں لیے بیٹھے رہے
محفلِ مینا میں ترکِ مے کیے بیٹھے رہے

عینِ ہنگامِ بہاراں ہوش کے مارے ہوئے
زیرِ شاخِ غم سرِ وحشت لیے بیٹھے رہے

عمر بھر سنتے رہے ہستی کا پیغامِ خروش
اور ہجومِ بے دلی سے لب سیے بیٹھے رہے

داد دے ساقی کہ تیرے دورِ نوشانوش میں
ہم ہی تھے جو مست و بیخود بے پیے بیٹھے رہے

پیرِ مے خانہ تری سرکار کے رِند ہوئے
زندگی بھر گوشۂ عزلت لیے بیٹھے رہے

پوچھ مت محفل سے کیا کیا چاک داماں لے گئے
سینکڑوں اہلِ طلب دامن سیے بیٹھے رہے

زندگی حقّی اِسی پوجا میں پوری ہو گئی
شمعِ حسرت سامنے روشن کیے بیٹھے رہے

اے خوشا سازِ خوشنوائے غزل
جاں فدائے غزل ہے ہائے غزل

شعر میں نیشتر کا لطف کہاں
یعنی بیرون و ماسوائے غزل

دیکھتا کون حالِ دل کی طرف
کھینچ لیتی نہ گر نوائے غزل

کھائیے گا نہ سادگی کے فریب
پوچھئے دل سے غمزہائے غزل

اس کے دم سے ہے دردِ دل کا ظہور
ہر کہ دمہ ہے مبتلائے غزل

ہے یہ لے گوشِ خلق کو مرغوب
جانِ گیتی ہیں نغمہائے غزل

وہ بھی لیتی ہے اب غزل میں پناہ
وہ جو اک شئے بھی ماورائے غزل

ترک کیوں کیجے دوستی ہی تو ہے
یہ بھی اک رسمِ زندگی ہی تو ہے

لب پہ پھیکی سی اک ہنسی ہی تو ہے
دیکھیے یہ بھی بے رخی ہی تو ہے

سیرِ بت خانہ و حرم بھی سہی
ایک بازارِ زندگی ہی تو ہے

پہلے اپنا سراغ تو ڈھونڈیں
مل رہے گی تری گلی ہی تو ہے

جامِ رنگیں کو اُس کے ہونٹوں سے
اِدّعا ہے برابری ہی تو ہے

متاعِ درد بہت ہے قرار ہو کہ نہ ہو
غمِ بہار سلامت بہار ہو کہ نہ ہو

نہیں ہوا ابھی تاثیرِ شوق سے مایوس
ترے کرم پہ مجھے اعتبار ہو کہ نہ ہو

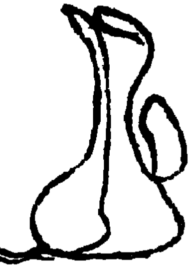
ہوئے ہیں کش مکشِ روزگار کے خوگر
ہو لئے خلد ہمیں سازگار ہو کہ نہ ہو
فراغِ یاس مناسب مگر بتا اے دل
حیات میں یہ زمانہ شمار ہو کہ نہ ہو
یہ سب فریبِ ہوس تو نہیں ہے اے ہمدم
بتا کہ دل پہ مجھے اعتبار ہو کہ نہ ہو
بقا کی راہ یہیں ڈھونڈ جائیے حقی
قضا کے ہاتھ سے تکمیلِ کار ہو کہ نہ ہو

فسونِ جبر سے لب تک ہلا نہیں سکتے
فغاں کہ تہمتِ ہستی اٹھا نہیں سکتے
قضا سے گوشِ تمنا نے سن رکھے ہیں مرے
کچھ ایسے راز کہ ہونٹوں پہ آ نہیں سکتے
مرے خیال کی روحِ رواں ہیں وہ خلشیں
وہ وسوسے جو کبھی دل سے جا نہیں سکتے

بھڑک اٹھی ہے مرے شعلۂ فغاں سے وہ آگ
کہ جس کو نوح کے طوفاں بجھا نہیں سکتے

حجابِ رشک سہی اور غبارِ وہم سہی
مگر وہ ہم سے نگاہیں ملا نہیں سکتے

نہاں عدم میں مری شوخئ قلم کے لئے
وہ رنگ ہیں کہ خیالوں میں آ نہیں سکتے



جوشِ مینا

(متفرقات)

پھر مرے ہاتھ میں لبریز ہے مینائے غزل
یک "جوئے شیر" نہیں لرزشِ صہبا کا بدل
آئینہ شدّتِ احساس سے جاتا ہے پگھل
تب کہیں گوشۂ تخئیل میں کھلتے ہیں کنول
تشنہ جانوں نے دیا نظمِ خرابات بدل
حکمِ امروز سے بڑھ کر نہیں قانونِ ازل
پائے ہمّت کو ہُوا زورِ سلاسل سے نصیب
پہلے کب عزمِ سفر میں تھے یہ طوفاں کے سے بل
تیری باتوں کے اُجالے تری یادوں کے چراغ
میری دُنیا میں نہیں چاند ستاروں کا عمل

خود مری چشمِ طلبگار کو بھی کیا معلوم
کن نگینوں کے مکاں ہیں یہ خیالوں کے محل

کس نے اُس بُت کو سکھا دیں یہ دورنگی چالیں
بزمِ ساقی میں سکوں خلوتِ زاہد میں خلل

اُن کو یہ ضد ہے کہ ہاتھوں سے نہ جائے گل راز
دل وہ کافر ہے کہ آنکھوں کا اُڑا لے کاجل

شاطرِ دہر یہ ٹھہری ہوئی بازی کب تک؟
چال ممکن ہو تو چل اور نہیں ممکن تو بدل

نام ہے سُنِ عمل حُسنِ نظر کا حقّی!
لو کسی بُت سے اگا لے کہ ہوں سب کرم پھل

جنوں نے خواب ہی دکھلائے ہونگے خرد نے دام بھی پھیلائے ہونگے!
نہ جانے ہیں کہانتک یہ اندھیرے نہ جانے ہم کہاں تک آئے ہونگے
دلوں کا مول ہیں وہ سنگریزے جو تو نے راہ میں ٹھکرائے ہونگے
کسی نے آگ بھی بھڑکائی ہوگی تو ہم نے پھول ہی برسائے ہونگے
کشش رکھتی ہے ریگِ راہِ منزل قدم رہبر نے کیا بھٹکائے ہونگے

کروگے ایک دن تم یاد ہم کو ابھی تو خیر کیوں یاد آئے ہونگے
سبھی ہوگی مری شاخِ نشیمن پھر یہ برق کے لہرائے ہونگے
حقیقت ہے اگر پیغام تیرا پھر افسانے کہاں سے کئے ہونگے
زمانہ اور کیا بہلاتے دل کو تماشے تو بہت دکھلائے ہونگے
بہاریں ہونگی ہم ہونگے وہ ہوگا
چمن لہکے گا یا دل چھائے ہونگے

بگڑی ہے بہت بات بناتے بھی نہیں تم
دیوانہ ہوں میں، ہوش میں لاتے بھی نہیں تم
اب رنگِ تکلف سے بھی روشن نہیں آنکھیں
ہونٹوں کو تبسم سے سجاتے بھی نہیں تم
بے جا سہی ہر شکوہ، مگر کیونکہ سہا جائے
یہ ظلم کہ رُوٹھیں تو مناتے بھی نہیں تم
میرے ہی خیالوں نے کہا سارا فسانہ
ویسے تو کوئی بات بتاتے بھی نہیں تم

اے وہ نظروں کے معنیٰ سادہ! سخت مشکل ہے ہمزباں کی بات
غیر ہی کا یقیں کیا آخر اُس نے رکھ لی مرے گماں کی بات

ہم اہلِ وفا اُٹھ نہ سکے کوئے وفا سے بیٹھے رہے گرتی ہوئی دیوار کے نیچے
یہ بات بھی تہذیبِ گلستاں میں ہے کہ بس بستر نہیں ہوتا کسی بیمار کے نیچے

کرتی ہے نظرِ لطف کا بس ایک اشارا ملتا نہیں بے دل کو یہ پیغام دوبارا

کس کی پیاس بجھے گی یارب! ایک گلو اور سو شمشیریں!

ہے مرا اشکِ رواں سیلِ ترنم گویا اور کچھ دن رہے آنکھوں میں تو کیا ہو جائے!
سخن آرا ہوں اِسی دھن میں کہ شاید حتّیٰ بات دل کی کسی عنواں سے ادا ہو جائے

دل پہ گزرے گی اگر جاں پہ گزارا نہ کریں اے غمِ زیست کہاں تک تری پروا نہ کریں

پیدا ہوئے تھے بعد میں افسانہائے راز پہلے نظر ملی تھی کسی پردہ دار سے

صورت ہی غم کی عہدِ بہاراں بدل گیا　　چاکِ جگر سے چاکِ گریباں بدل گیا

بستی سے زیادہ کوئی ویرانہ نہیں ہے
جو دشت میں پھرتا ہے وہ دیوانہ نہیں ہے
کیا خاک بر آئے گی نگاہوں کی تمنّا
دل میں ہی کوئی صورتِ جانانہ نہیں ہے
پائیگا کوئی گردشِ دوراں سے بھی کیا فیض
قسمت میں اگر گردشِ پیمانہ نہیں ہے

کافر سہی یہ تشنہ نگاہوں کی اوٹ میں
دیکھی ہے میں نے صورتِ یزداں کبھی کبھی

بات کرتے ہیں تو کہتے ہو کہ وحشت ہے تمہیں
جیسے وحشت کا مداوا یونہی ہوتا ہوگا

آتی نوائے ساز جو محفل فروز ہے　　میرا ہی درد میری زباں میرا سوز ہے

روشن ہیں تیری یاد سے آنکھیں فراق میں — یہ بھی عجیب خلوتِ خانہ فروز ہے

گزرا ہے کبھی تم پہ بھی مرغانِ چمن زاد
وہ عالمِ غربت کہ نہ دیسے یہ چمن ساتھ
ہے راس بہت اس کو خرابات کا موسم
جنّت میں بھی جائے گی مرے دل کی جلن ساتھ

باقی ہے اب بجائے نفس اک صدائے درد — بس اک نوائے نے ہے جو نے کا نشان ہے

ہم مصلحت شناس ہیں وہ مدّعا شناس — بیمار اِس لئے ہیں کہ اچھا کرے کوئی
آمیزشِ کرم ہے کسی کی نگاہ میں — ایسے میں ایک لغزشِ بیجا کرے کوئی

اِسی سحر پہ نہیں حشرِ آرزو موقوف — بطونِ شب میں ہزار آفتاب اور بھی ہیں

ناکامیٔ دل کی شرم رہے اب دل کی دعا کچھ اور سہی
جو اَب نہ ملا وہ جب نہ ملے، اے میرے خدا کچھ اور سہی

یوں تو جس ذرّے کو چاہوں وہ ستارا بن جائے
کون ہے جو مری نظروں کا سہارا بن جائے

اور کچھ دم سہی بیگانۂ ہوش ختم ہونے کو ہے افسانۂ ہوش
کس قدر ہوش ہے معلوم نہیں ہے کہاں تک خطِ پیمانۂ ہوش!

ولۓ رسوائی ذوقِ مستی بادہ کش بن گئے پیمانہ فروش

چھپایا ہی نہیں جاتا خمارِ شوقِ پوشیدہ
ترے کوچے میں اُٹھتے ہیں قدم لغزیدہ لغزیدہ
ذرا دامن کو چھو لیجے تو ہو جاتے ہو رنجیدہ
کبھی مدہوش متوالے کبھی بنتے ہو فہمیدہ
وہ بیٹھے ہیں خفا ہو کر بڑے سنجیدہ سنجیدہ
کچھ اپنے دل سے ہوتے ہیں سخن پوشیدہ پوشیدہ

قطعہ

اشک ہمرنگِ سخن ہے، دُرِ ناسفتہ سہی
لب ہیں عاجز تو لبِ زخم ہی بشگفتہ سہی
اے صبا برگِ گُلِ رنگیں ہے مرا محرمِ راز
تذکرہ شوق کا ناگفتہ ہے ناگفتہ سہی

زیر طبع

شاخسانے

حقی کے افسانوں کا مجموعہ

- مہاوت کی بیٹی
- نبی کا توتا
- آهنی مورت
- دل کی مرادبر
- سہاگ مالا
- اشتہار
- همسائے میں خون

اور دوسرے افسانے

عنقریب شائع ہوگا۔

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

انتخابِ ظفر

از شان الحق حقی

بہادر شاہ ظفر کے چار مبسوط دیوانوں کا انتخاب

آردو شاعری کا ایوان معلیٰ

جس کے ساتھ آخری مغل تاجدار کی حیات اور شاعری

پر ایک مفصل مقدمہ شامل ہے

ہمارا ادارہ ظفر کے نادر و منفرد اور پرتاثیر کلام کو جو اب تک اپنی کمیابی اور ضخامت کے باعث عموماً بے توجہی کا شکار رہا ، خاص اہتمام کے ساتھ نہایت آراستہ و پیراستہ صورت میں شائع کر رہا ہے اور عنقریب قدردانوں کی خدمت میں پیش کریگا۔

ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحات ،

دو رنگی مزین طباعت ، دیدہ زیب سرورق

زیر طبع

حق کے تنقیدی مضامین

- اکبر کا فن ظرافت
- اصغر کی غزل
- صحیح غالب
- نادان دہلوی
- قاضی نذرالاسلام
- آزاد نظم
- رسم الخط کی الجھن

اور دوسرے مقالات
عنقریب شائع ہونگے۔

اردو اکیڈمی سندھ کراچی